عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

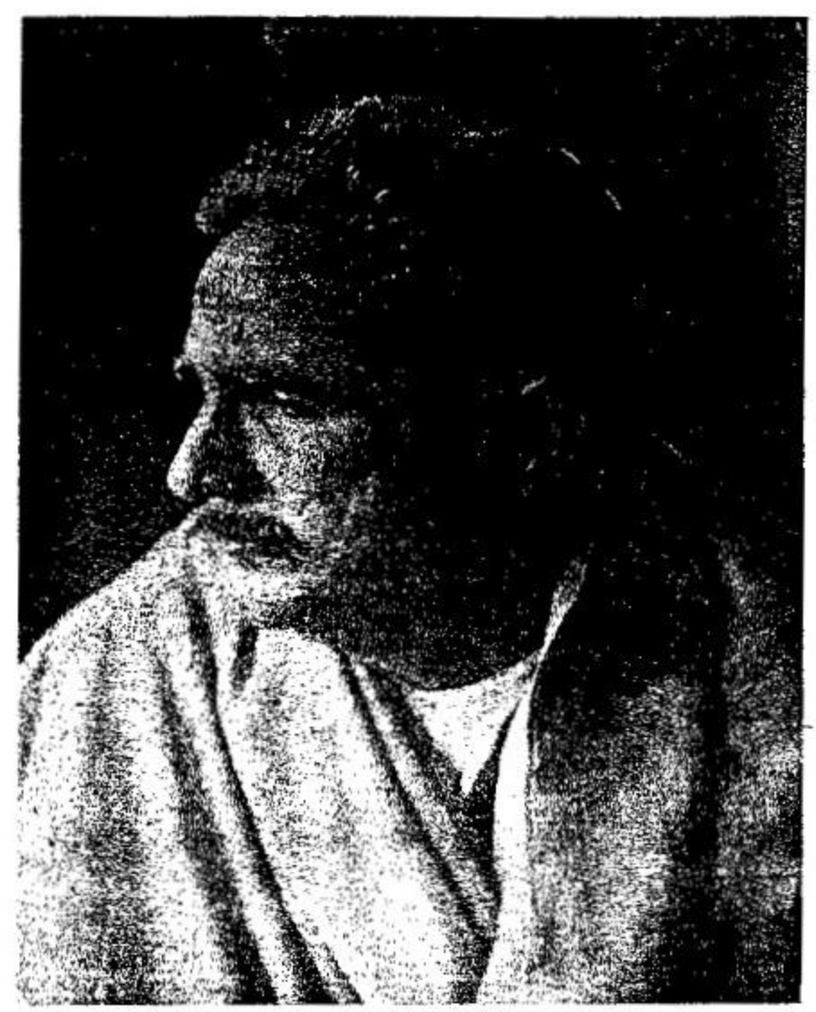

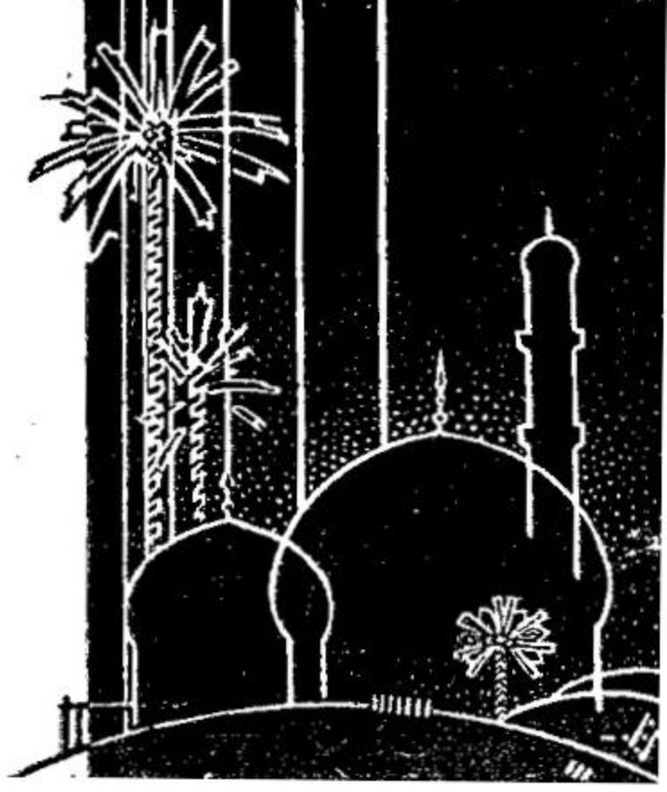

June 1939

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے قیمت ۴ر محصول ڈاک ار

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

از جناب رازی، اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

سوراجی اسلام

از جناب رازی، سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جسنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۸ر

زبان کا مسئلہ

از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کررہے ہیں قیمت ۱۰ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب

محمد ظہیر الدین صدیقی بی۔ایس سی

جلد ۲ شمارہ ۲

بدلِ اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ — فی پرچہ آٹھ آنہ

ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ مطابق جون ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱۔ لمعات	ادارہ	۳ - ۸
۲۔ حقائق و عبر	ادارہ	۹ - ۲۱
۳۔ حیدرآباد اور کشمیر	ایم۔ایس۔ٹی صاحب	۲۲ - ۳۱
۴۔ خاتونِ حرم	اسد ملتانی	۳۲
۵۔ اندرونِ ہند		۳۳ - ۴۰
۶۔ اسلام اور مذہبی رواداری	چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۴۱ - ۶۰
۷۔ متبادل دستورِ ہند	ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب	۶۱ - ۷۸
۸۔ واردھا تعلیمی اسکیم اور جمعیت علماء ہند	ادارہ	۷۹ - ۸۳
۹۔ تقریظ و تبصرہ	ادارہ	۸۴ - ۸۷
۱۰۔ رسید کتب	ادارہ	۸۸ -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزِ ملت → [لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ] ← مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فی ما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یاایھا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا	استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو	بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کے طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنے

مرکز مرکزی کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا	جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار	لا اسلام الا بالجماعۃ
(فرمان رسولؐ)	(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

لمعات

مسلمان جب جانتا تھا کہ جماعت اور اسلام کا کیا تعلق ہے تو اُس کا اپنی جماعت سے الگ ہو جانا تو درکنار اگر کبھی کسی جرم کی پاداش میں کچھ وقت کے لئے جماعت اُسے الگ کر دیتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ اُس پر مصائب و آلام کی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ خدا کی یہ وسیع و عریض زمین اُس پر تنگ ہو جاتی دُنیا اُس کی نظروں میں اندھیر ہو جاتی۔ زندگی دوبھر ہو جاتی۔ جینا محال ہو جاتا۔ حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب اُنھیں ایک کوتاہی کی بنا پر جماعت سے علیٰحدہ کر دیا گیا تو چند روز میں اُن کی کیا حالت ہو گئی یہ وہ مسلمان تھے جنھیں معلوم تھا کہ جماعت سے علیٰحدگی ایک مسلمان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ جن کا ایمان تھا۔ کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لیکن ـــــ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند ـــــ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے وہ جماعت کے ساتھ ہوتے ہیں تو اِس لئے کہ اس کے اندر اُن کی کوئی اپنی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ ساتھ رہتے ہیں تو اُس وقت تک جب تمام معاملات اُن کی مرضی کے مطابق طے پاتے ہیں لیکن جونہی کوئی فیصلہ اُن کی منشاء کے خلاف ہوا وہ جھٹ جماعت سے الگ ہو گئے۔ اور پھر یہی نہیں کہ الگ ہو کر چپکے بیٹھے رہیں۔ اپنی اِس مذموم حرکت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جماعت کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ہر جگہ اُسے بدنام کرتے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ صاحب جب جماعت کے ساتھ تھے تو اِس احساس کے ماتحت نہیں تھے کہ جماعتی زندگی اسلامی زندگی ہے۔ اِس لئے جب جماعت سے علیٰحدہ ہوئے تو یہ احساس کیوں پیدا ہو کہ اُن سے کوئی غیر اسلامی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اور پھر اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جماعت کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں جس سے یہ خائف ہوں۔ دِل میں خُدا کا ڈر نہیں۔ جماعت کے پاس قوت نہیں۔ اِس لئے جو کسی کے جی میں آئے کرے۔ جو مُنہ میں آئے کہدے۔ حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ـــــ ورنہ اگر دل میں اسلامی زندگی کی قیمت اور باہر جماعت کی

قوت کا احساس ہوتا تو کیا آج سر عبدالحلیم غزنوی صاحب اپنی پارٹی سے استعفیٰ دے کر یہ کچھ کرتے پھرتے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ ان کے اپنے دل میں احساس ہوتا تو کسی کو منہ نہ دکھا سکتے۔ اور ملت میں اجتماعیت ہوتی تو انھیں بھی معلوم ہو چکا ہوتا کہ

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سراج الدولہ کی سلطنت کو مٹانا ہو تو کسی میر جعفر کو پیدا کرو۔ ٹیپو سلطان کو شکست دینا مقصود ہو تو کسی صادق کو آمادۂ غداری کرو۔ حرمِ پاک میں ترکوں کے سینوں کو چھلنی بنانا ہو تو کسی شریف حسین کو سنگینوں سے مسلح کر دو۔ یہی بساطِ سیاست کی چالیں ہیں۔ یہی "رموزِ مملکت" ہیں۔ جس قوم نے مسلمانوں کو تباہ کیا، اسی حربہ سے کیا۔ جو انھیں اب تباہ کرنا چاہتی ہے وہ بھی اسی حربہ کو لئے ہوئے ہے۔ کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت جن زہرہ گداز چیرہ دستیوں اور جگر خراش ستم رانیوں کی شکار بن رہی ہے، دوسرے مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ آج پریس ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے اپنی آواز دوسروں تک پہنچائی جاتی ہے۔ اور پریس مسلمانوں کے پاس ہے نہیں۔ ان صوبوں کے ستم رسیدہ مسلمانوں نے دم گھٹ کر مر جانے کے بجائے یہ سوچا کہ پریس نہیں ہے تو فوراً اٹھ کر چلو اور دوسرے مسلمانوں کو اپنی مظلومیت کی الم انگیز داستان خود اپنی زبان سے سناؤ۔ یہ ہے جذبۂ محرکہ ان وفود کا جنھوں نے اس ماہ پنجاب بھر کے مختلف گوشوں میں دورہ کیا ہے۔ اور جن کے دورہ سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلی ہیں کہ ہندوستان میں ان پر کیا گذرنے والی ہے۔ یہ شکایات ہندو اربابِ حکومت کی دراز دستیوں کے خلاف تھیں۔ اگر یہ غلط تھیں تو انھیں چاہئے تھا کہ ان کی تردید کرتے لیکن انھیں اس کی ضرورت کیا تھی کہ خود سامنے آکر خواہ مخواہ بدنام ہوتے جبکہ انھیں نہایت آسانی سے ایسے "مسلمان" مل سکتے تھے جو اپنے ان مظلوم بھائیوں کے گلے پر نہایت سفاکی دیدہ دلیری سے چھری چلا دیتے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کانگریس کی طرف سے ان وفود کے خلاف براہِ راست کچھ نہیں کہا گیا لیکن جہاں جہاں ان کی مخالفت کرائی گئی، خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے کرائی گئی۔ حتیٰ کہ لدھیانہ میں تو

اس مخالفت نے کھلی ہوئی جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

سچ ہے۔ قلب سے ایمان سلب کرو۔ اور روٹی اپنے قبضہ میں رکھو۔ اس کے بعد جہاں جی چاہے مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ سے ذبح کرادو۔ یہی ہے وہ ننگِ آدم۔ ننگ دین۔ ننگِ وطن تام کا مسلمان جس کا ناپاک وجود ملتِ اسلامیہ کے جسدِ مقدس پر برص کا ملعون نشان ہے۔ یہی ہے وہ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیشِ دہریاں اندر نیاز

دینِ او آئینِ او سوداگری — عنتری اندر لباسِ حیدری

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر — رسمِ او۔ آئینِ او گردد دگر

پیش ازیں چیزے دگر مسجودِ او — در زمانِ ما وطن معبودِ او

ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند — باطنش چوں دہریاں زنار بند

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است — ایں مسلمانے کہن ملت کش است

خند خنداں است و باکس یار نیست — مار اگر خنداں شود جز مار نیست

کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ضابطۂ تعزیرات میں ایک قانون موجود ہے کہ جس شخص کا کوئی ذریعۂ معاش متشخص و متعین نہ ہو پولیس اس کا چالان کر دیتی ہے اور عدالت تحقیق کرتی ہے کہ اس کے گذارہ کی کیا صورت ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس ہندوستان میں ایسے ایسے معتبر "راہ نمایانِ ملت" موجود ہیں جو نہایت امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کا بظاہر کوئی ذریعۂ معاش نہیں۔ اور حیرت ہے کہ انھیں نہ پولیس گرفتار کرتی ہے نہ عدالت میں ان کا چالان ہوتا ہے۔ شاید پولیس کو ان کا ذریعۂ معاش معلوم ہوتا ہو۔ لیکن بہرحال قوم کو تو بظاہر نظر نہیں آتا۔ قوم کو یہ حضرات ہمیشہ یہی بتاتے ہیں کہ ہم تمھاری خدمت بلا مزد و معاوضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہی دردمندانِ ملت ہیں جو درحقیقت ملت کے ہر قسم کے درد کا اصلی باعث ہیں۔ اور آج ان کا علاج یہ ہے کہ قوم ان کے گذارہ کی کوئی سبیل پیدا کرے۔ ورنہ بھوک (بلا ایمان) سے جو کچھ سرزد ہو تھوڑا ہے۔ پیشہ ور لیڈر

خدا کا عذاب ہے۔ جو ہر اُس قوم پر مسلط کیا جاتا ہے جس کی اجتماعیت اور مرکزیت فنا ہو چکی ہو۔

ہم شروع ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ جب قرآن کریم نے ہمیں بتا دیا ہے کہ کفار کبھی مسلمانوں کی بہتری کے خواہاں نہیں ہو سکتے بلکہ وہ ہمیشہ اُن کی تخریب کے درپے رہتے ہیں تو پھر یہ کہنا کہ قومیت پرست ہندو ہمارا دوست ہے اور مہاسبھائی ہندو دشمن۔ اگر منافقت نہیں تو کم از کم خود فریبی ضرور ہے۔ جس طرح سے انگریز انگریز ہے خواہ وہ لائڈ جارج ہو یا چیمبرلین۔ اسی طرح ہندو ہندو ہے خواہ وہ ڈاکٹر مونجے ہو یا مہاتما گاندھی۔ بھائی پرمانند ہو یا پنڈت نہرو۔ مہاسبھا اور کانگریس۔ سناتنی اور آریہ سماجی یہ سب ان کی اندرونی تقسیم ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں اِن سب کا محاذ متفقہ ہوتا ہے۔ ہم نے تحریک حیدرآباد کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ یہ صرف مہاسبھائیوں کی شورش نہیں بلکہ اس میں بڑے بڑے قومیت پرست ہندو بھی شامل ہیں۔ اس پر ہمارے بہت سے مسلم قومیت پرست حضرات چیں بجبیں ہو گئے۔ اور کہدیا کہ یہ ہمیشہ سوءِ ظنی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن واقعات نے انھیں بھی مجبور کر دیا کہ بالآخر ہم سے متفق ہوں۔ چنانچہ اِس ضمن میں انصاری جیسا کانگریسی اخبار اپنے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے :-

"لُدھیانہ میں جو اسٹیٹس سبجکٹس کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس موقعہ پر حیدرآباد کے متعلق آریہ سماجی تحریک کے بارے میں کانگریسی زعماء کا طرزِ عمل کچھ بدل گیا تھا لیکن پھر بھی جو ریزولیوشن وہاں منظور ہوا ہے۔ اس میں حیدرآباد کی آریہ سماجی تحریک کو فرقہ وارانہ ضرور قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی ایک طرح سے مذمت بھی نکلتی تھی۔ مگر اس کے پیچ در پیچ الفاظ کا جو مفہوم کچھ دن ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان کیا ہے اور جس سے اُس کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے وہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس تحریک کی پُشت پناہی پنڈت جواہر لال نہرو بھی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اُسے اپنی اخلاقی امداد پہنچا رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اِس فساد کو جو مُلک میں برپا ہے روکنے کی

کوشش نہیں کرتے بلکہ اس قسم کا بیان آریوں کو دے رہے ہیں جو اُن کے حوصلے بڑھانے والا ہے۔ دوسری طرف گاندھی جی برابر آریہ سماجی لیڈروں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ اور ایک تازہ خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر ایک آریہ سماجی وفد ان سے اِس سلسلہ میں ملنے والا ہے ..... یہ باتیں ایسی ہیں جو حد درجہ قابلِ اعتراض ہیں اور جن سے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں کانگریسی لیڈروں کا طرزِ عمل نہ صرف مشتبہ بلکہ کھلم کھلا آریہ سماجی تحریک کے موافق ہو جاتا ہے اور اس پر تمام ہندوستان میں اظہارِ ناراضگی ہونا یقینی ہے۔ کانگریس کی قیادت کرنے والوں کا فرقہ واریت کے سمندر میں اس طرح غرق ہو جانا کس اُصول کے تحت صحیح ہو سکتا ہے!" (انصاری ۱۱ مئی ۱۹۳۹ء)

جس نتیجہ پر انصاری آج پہنچا ہے ہم نے اس کی طرف اُسی زمانہ میں اشارہ کر دیا تھا جب لدھیانہ کانفرنس میں مذکورہ صدر ریزولیوشن پاس کیا گیا ہے۔ ہم میں اور ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات میں فرق یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی اس قسم کی ذہنیت کے پیشِ نظر نہ خود کسی دھوکے میں رہتے ہیں نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے قومیت پرست حضرات ہندو ذہنیت کے بارے میں ہم سے متفق ہونے کے باوجود مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے سراب کی طرف دعوت دیتے ہیں اور انھیں نہرو اور گاندھی اتباع و اطاعت میں اسلام دوستی کا راز بتاتے ہیں۔ آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ حق و انصاف کا کون سا مسلک ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔

سابقہ پرچہ میں مولوی احتشام الدین صاحب کا مضمون "صدائے قوم" شائع ہو چکا ہے۔ ہر چند ہمیں اِس کی جزئیات سے کامل اتفاق نہ تھا لیکن چونکہ اس میں قوم کے سامنے اکثریت کی ایک تجویز پیش کی گئی تھی اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ اس تجویز کو قوم کے سامنے رکھ کر مختلف صائب الرّائے حضرات کو مشورہ کی دعوت دی جائے۔ اس باب میں ہمارے پاس متعدد تجاویز پہنچ چکی ہیں۔ اور ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی ہے کہ اب ایسی صدائیں محض صدا بہ صحرا بن کر نہیں رہ جاتیں۔ تجاویز موصولہ میں زیادہ تر

ایسی ہیں جو اس اسکیم کی مؤید ہیں جو اس باب میں ہمارے پیش نظر ہے۔ ہم انشاء اللہ مستقبل قریب میں اس اسکیم کا خاکہ پیش کرینگے۔ خدا کرے کہ وہ اسکیم اس قلب و نظر کی پریشانی کے دور میں مسلمانوں کے لئے صحیح نصب العین کی طرف قدم اٹھانے کا موجب ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اپریل کے اخیر میں اراکین ادارۂ طلوع اسلام کی خدمت میں ایک گشتی عریضہ ارسال کیا گیا تھا۔ بعض حضرات کے جواب کا ابھی تک انتظار ہے۔ چونکہ آئندہ سال کے لئے جو تجاویز ہمارے پیش نظر ہیں ان کے متعلق جلد از جلد کسی فیصلہ پر پہنچنا ضروری ہے اس لئے ان حضرات سے درخواست ہے کہ جواب عریضہ سے جلد سرفراز فرمائیں۔

جن خریداران کی خدمت میں تجدید خریداری کا اطلاعی کارڈ بھیجا جاتا ہے انھیں اس کا جواب ضرور دینا چاہئے ورنہ انتظام میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔ اور انھیں بھی شکایات پیدا ہوتی ہیں۔

اطلاع

گذشتہ اعلانات کے باوجود جون۔ جولائی اور جنوری کے پرچے حاصل نہ ہو سکے۔ لہٰذا ان مہینوں کے پرچوں کے مطالبہ کی تعمیل نہ ہو سکیگی۔

مزید اعلان کیا جاتا ہے

کہ دفتر جون۔ جولائی اور جنوری کے پرچوں کا آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے خریدار ہے جو صاحب ان مہینوں کے پرچوں کو علیحدہ کرنا چاہیں دفتر کے پتہ پر ارسال فرمادیں۔

(مینجر)

حقائق و عبر

تلاشِ امن

یوں تو تاریخ انسانیت میں کرب و اضطراب کے بہت سے ادوار گذرے ہیں۔ لیکن دنیا عدم اطمینان و فقدانِ سکون کے جس جہنم سے آج گذر رہی ہے اس کی مثال شاید ہی چشم فلک نے کبھی دیکھی ہو۔ ذرا تصور میں لائیے، کہ آج دنیا کے ہر ملک، ملک کے ہر قریہ، قریہ کے ہر مکان، مکان کے ہر مکیں کا قلبِ پریشاں کس قدر شعلہ سامانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ دنیا چاروں طرف تلاشِ سکون میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ لیکن بے سود۔ تڑپ رہی ہے۔ لیکن بے نتیجہ۔ اٹلی والوں نے اگلے دنوں تمام دنیا کی طاقتوں کے نام اپیل کی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا پیدا ہو جو یورپ کو اس آنے والی تباہی سے بچالے۔ "مقدس پوپ" پیامبر امن و سلامتی جناب مسیح کا واسطہ دلاکر عیسائی دنیا کو امن کی دعوت دیتا ہے۔ انگلستان کا سابق شاہنشاہ، ڈیوک اوف ونڈسر محطۂ نشر الصوت سے درخواستیں پیش کر رہا ہے کہ دنیا والو۔ انسان بنو، امن عامہ کے قیام کے لئے ایشیائی ممالک کی ایک کانفرنس، زیر صدارت سابق شاہ حبش، منعقد کی جارہی ہے، غرضیکہ ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق قیام امن کا متمنی ہے، لیکن کسی کا کچھ بس نہیں چلتا اور دنیا تباہی اور بربادی کے عمیق و مہیب غاروں کی طرف جارہی ہے۔

لیکن آپ نے کبھی غور بھی کیا کہ انسانوں کی یہ بے بسی کیوں ہے؟

اگر کہیں دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو تیسرا آدمی انہیں چھڑا دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس کے بس کا نہ ہو تو حکومت کا سپاہی آتا ہے اور انہیں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر دیتا ہے۔ جو مجرم کو سزا دیتی ہے۔ اسی طرح اگر دو قبیلے آپس میں جھگڑ پڑیں، تو ان کے تنازعات

بھی ان سے بڑی حکومت مٹا دیتی ہے۔

لیکن اگر دو حکومتیں آپس میں آمادۂ پیکار ہو جائیں تو انہیں کون چھڑائے؟ ان کے تنازعات کا فیصلہ کیسے ہو؟ مدبرین یورپ نے تنگ آکر اس کی یہ صورت پیدا کی، کہ اقوام عالم کے نمائندوں کی ایک لیگ بنائی جائے۔ لیکن اس لیگ اوف نیشنز کا جو حشر ہوا، وہ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ اب اس کے بعد کیا ہو؟

دنیا کو سرگرداں پھرنے دیجئے۔ اسے پریشان ہونے دیجئے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ ہار تھک کر دنیا خود بخود مجبوراً اس نتیجہ پر پہونچے گی کہ انسانوں کے تنازعات کا فیصلہ انسانوں کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا۔ یہ صیغہ کسی ایسی قوت کے سپرد ہونا چاہئے، جو انسانوں سے بلند و بالاتر ہو۔ اور وہ قوت صرف خدا کی قوت ہے۔ جبتک دنیا اپنے آپ کو خدا کی حکومت کے ماتحت نہیں لاتی۔ امن و سکون کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! یہ "خدا کی حکومت" قرآن کریم کے قوانین و ضوابط کی رُو سے قائم ہوگی۔ اور اس کے قیام و بقا کی ذمہ دار وہ جماعت ہوگی جسے قرآن کریم حزبُ اللہ کہتا ہے۔

سیاسی دنیا میں انسان کا معراج کمال لیگ اوف نیشنز تھا علمی دنیا میں اس کی ترقیوں کا منتہیٰ سائنس کے انکشافات ہیں۔ ان انکشافات کا تہذیب انسانی پر کیا اثر ہوا ہے؟ اس کے متعلق دنیائے سائنس کے ایک سب سے بڑے عالم کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر ہیرلڈ اُرے نے جنہیں ۱۹۳۴ء میں نوبل پرائیز ملا تھا۔ سائنسدانوں کی ایک ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"کیمسٹری ہماری یورپین تہذیب کو فنا کر سکتی ہے اور کر کے رہے گی۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہیں کہ ہماری تہذیب یکسر تباہ ہو جائے گی۔ اگر لوگ چاہتے ہیں کہ روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو کیمسٹری ان کے اس ارادے میں

ان کی بہت مدد کرے گی۔ یہ لوگوں کو ہلاک کردے گی، ان کی املاک کو
تباہ کردے گی۔ اور دنیا کے مختلف سرچشموں کو برباد کر کے رکھدے گی"
(نیشنل ہیرلڈ $\frac{11}{8/39}$ ۵)

یہ ہے نتیجہ اس علم کا جو خدا کو الگ کر کے حاصل کیا جائے۔ اگر اس علم کے ساتھ کہیں خدا پر ایمان موجود ہوتا، تو یہی علم اس دنیا کو جنت بنا دیتا۔

اب ذرا ان اقوام یورپ کی اخلاقی کیفیت ملاحظہ فرمایئے۔ جرمنی میں بچوں کی پیدائش کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ اسے پورا کرنے کے لئے ایک شہر کے میئر نے اعلان فرمایا ہے کہ

"ایسی غیر شادی شدہ لڑکیاں جن کی عمر ۲۹ سال سے زائد ہو انہیں چاہیئے کہ اس بارے میں قوم کی مدد کریں۔ اگر وہ حکومت کو اپنے اس ارادے سے مطلع کر دیں کہ وہ بچے پیدا کریں گی تو میونسپلٹی کی طرف سے ہر بے باپ بچہ، کو پانصد مارکس کا عطیہ دیا جائے گا۔ اور اس کی پرورش بھی میونسپلٹی کے ذمہ ہو گی" (اسٹیٹسمین $\frac{9}{4}$ ۱۴)

کہئے کہ انسانیت کے لئے اس سے بڑھکر ڈوب مرنے کا کوئی اور مقام بھی ہو سکتا ہے؟ یہ ہے ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ السّٰفِلِیْنَ۔ کا وہ شرمناک منظر جس سے شاید ابلیس بھی منہ چھپا لے۔

نشۂ حکومت کی بدمستیاں

"کانگریسی صوبہ کے اندر طاقت کی محض ایک خوراک نے ہمیں اپنی ہستی سے غافل کر دیا" کانگریسی اخبار۔ ایڈوانس، مورخہ $\frac{5}{39}$ ۱

یہ بدمستی صرف ارباب حکومت تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اس نشہ سے ان صوبوں کے تمام ہندو چُور ہیں جن میں کانگریسی برسر اقتدار ہیں۔ یہی وہ کم ظرفی تھی جس کی وجہ سے اگلے دنوں گیا کے ہندو بہک گئے۔ ایک گھر میں میاں بیوی میں کسی معاملہ پر جھگڑا ہو گیا۔ میاں کو غصہ آیا۔ اس نے سالن

کی ہنڈیا اٹھاکر باہر پھینک دی، نیچے ایک لڑکی جارہی تھی ہنڈیا اس پر جاگری۔ بدبختی یہ کہ ہنڈیا پھینکنے والا تھا مسلمان اور وہ لڑکی تھی ہندو۔ اب کیا تھا! فوراً مشہور کر دیا گیا کہ ایک مسلمان غنڈے نے گائے کا گوشت ایک شریمتی پر پھینک دیا۔ اکثریت کا جوش۔ حکومت کا نشہ۔ سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا، ہندوؤں نے مسلمانوں پر یورش کر دی، کئی جان سے گئے۔ کئی زخمی ہوئے، اور سارا الزام مسلم لیگ کے سر تھوپ دیا گیا کہ یہ اسی فرقہ پرستی کی تعلیم کا نتیجہ ہے جسے لیگ ملک میں عام کر رہی ہے۔

یہ ہیں ہندوستان کے مستقبل کے حکمران! اللہ سب کو اپنے حفظ امن میں رکھے۔

ہندوستان کا ہٹلر

سردار پٹیل نے اگلے دنوں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

"میں نے مسٹر بوس کو اس کے الیکشن سے قبل ایک تار دیا تھا جس میں اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا نام واپس لیلے۔ یہ تار میں نے مہاتما گاندھی کی خواہش کے مطابق دیا تھا۔ کیونکہ مسٹر بوس۔ مہاتما جی کے خیالات اور ان کے پروگرام سے متفق نہ تھا۔ نیشنل کال ۹ ۵/۳۹

دیکھا آپ نے! کانگریس کے اندر جمہوری روح کس رعنائی و زیبائی سے کارفرما ہے۔ ایک اور سند بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اچاریہ کرپلانی نے بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہمیں مہاتما گاندھی کی ذات پر کامل اعتماد ہے۔ اور ہر قسم کی عزت و عظمت انہی کے لئے ہے۔ کانگریس والوں کی کوئی اپنی پالیسی اور پروگرام نہیں۔ سب پالیسی اور پروگرام گاندھی جی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۱ ۵/۳۹

ذرا مسلم قومیت پرست حضرات، بالخصوص جمعیت علماء سے دریافت کیجئے۔ کہ

چیست یارانِ طریقت بعدازیں تدبیرِ ما؟

جادو وہ جو سر چڑھ بولے

مہاتما گاندھی نے جب قضیۂ راجکوٹ کے سلسلہ میں "مرن برت" کی تخویف و ترہیب کے ذریعے اپنی شرائط منوانے کا طوفان اٹھایا تھا تو ہم نے مارچ کے پرچہ میں لکھا تھا کہ اس قسم کے اہنسا (عدم تشدد) اور ہٹلر کے ہنسا (تشدد) میں کوئی فرق نہیں۔ اس طریق عمل کا نام اہنسا رکھ لینا، دھوکہ ہے۔ اس پر ہمارے بہت سے "مہاتما پرست" کرمفرماؤں نے ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جس کا اعتراف خود مہاتما جی کو بھی کرنا پڑا، کلکتہ سے واپسی کے بعد مہاتما جی پھر اسی راجکوٹ میں براجمان ہیں جسے انہوں نے چند روز پیشتر اپنی "آرزوؤں کا مدفن" اور "جوانی کا غارتگر" قرار دیکر خیرباد کہا تھا۔ یہاں پہونچ کر حالات پھر نامساعد دیکھے تو آپ نے اخبارات میں ایک طول بیان شائع فرمایا جس میں کھلے کھلے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے پچھلے برت کے سلسلہ میں جو کچھہ کیا وہ قطعاً اہنسا نہ تھا۔ بلکہ خالص ہنسا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"ہاں مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ جب میں نے اپنا برت توڑا ہے تو میں نے کہا تھا کہ جیسا کامیاب انجام اس برت کا ہوا ہے اس سے پیشتر کسی برت کا نہ ہوا تھا۔ لیکن میں اب محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ہنسا کا رنگ موجود تھا میں نے برت رکھتے ہی اس باب میں حکومت کی مداخلت چاہی کہ وہ ٹھاکر صاحب کو اپنے وعدہ کے ایفا پر آمادہ کریں۔ یہ کوئی اہنسا کا طریقہ نہ تھا، یہ ہنسا کا مسلک تھا۔ دوسرے پر ناجائز دباؤ ڈالنے کا طریق تھا۔" (مثیل کال مورخہ ۵/۳/۱۹)

دربار ویرداالہ کے متعلق جو روش مہاتما جی نے اختیار کی تھی اس کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ

"وہ بھی اہنسا کا طریق نہ تھا" (ایضاً)

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اپنے اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے دربار ویرداالہ پر جو دباؤ ڈالا کہ وہ ٹھاکر صاحب کو اصلاحات نافذ کرنے کا مشورہ دیں، تو یہ طریقہ بھی کیسر اہنسا

کے خلاف تھا۔ پھر ارشاد ہے کہ

"میں نے اپنی کمزوری کو تو اسی وقت محسوس کر لیا تھا لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کا علانیہ اعتراف کر لوں" (ایضاً)

ایک بات تو بالکل واضح ہے۔ مہاتما جی کی ساری عمر اہمسا پر عمل کرتے گذر گئی، وہ اپنے آپ کو اس کا ماہر (اکسپرٹ) قرار دیتے ہیں۔ (ایضاً)۔ اور دنیا میں کسی اور کو اپنے جیسا اہمسا کی روح کا واقف کار نہیں سمجھتے۔ لیکن اہمسا کے سب سے بڑے اوتار کی یہ حالت ہے کہ اپنے ایک فعل کو خالص اہمسا قرار دیتے ہیں۔ اس کی خاطر مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی شرائط مانی جاتی ہیں تو اسے اہمسا کی سب سے نمایاں اور بے مثال کامیابی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ زیادہ دن گذرنے نہیں پاتے کہ یہ حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی ہے کہ جسے وہ اتنا کامیاب اہمسا سمجھتے تھے۔ وہ تو خالص ہمسا تھا۔ اب آپ اسی سے اندازہ فرمالیجئے کہ ایک ایسا اصول۔ جس کے حق و باطل میں اس اصول کا سب سے بڑا "اوتار" بھی امتیاز نہ کر سکے۔ کیا کبھی قابل عمل قرار دیا جا سکتا ہے؟ جو روشنی انسان کے اپنے دماغ کی پیدا کردہ ہو، وہ کبھی روشنی نہیں کہلا سکتی۔ روشنی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو۔ اور وہ آج دنیا میں قرآن کریم کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی۔ حقیقت یہی ہے باقی سب چھلاوے ہیں۔

پھر ایک چیز اور بھی قابل غور ہے۔ تری پوری کانگریس کے اجلاس میں مسٹر پنتھ کے ریزولیوشن کے سلسلہ میں مہاتما جی کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ وہ (نعوذ باللہ)

"ہر غلطی سے منزہ۔ اور ہر لغزش سے معصوم ہیں"

انسانوں کی ایک راہ گم کردہ جماعت اپنے ہی جیسے ایک انسان کو یوں "خدا بنا رہی تھی۔ لیکن فطرت ان کی اس اندھی عقیدت پر خندہ زن تھی۔ اس جماعت کے یہ الفاظ ابھی فضا میں گونج

رہے تھے کہ خود اس انسان نے اس کا اعتراف کر لیا کہ راجکوٹ کے معاملہ میں میں نے سخت غلطی کی۔ اور خود اپنے طرز عمل کے پہچاننے میں دھوکا کھایا! انسانوں کو خدا بنانیوالے ان حقائق کا بغور مطالعہ کریں۔ اور سوچیں، کہ ان کے خود ساختہ خداؤں کی حقیقت کیا ہے؟ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

بھارت ورش کی تہذیب

کہتے ہیں کہ مہاراج بکرماجیت سے چھ سو سال پیشتر کسی بستی میں ایک سانڈ دیوتا بیمار ہو گئے۔ برہمنوں کی ایک جماعت پوتر پستکیں لیکر دیوتا کے اردگرد بیٹھ گئی اور اس کی آتما کی شانتی کے لئے اشلوک پڑھ پڑھکر پرارتھنا کرتی رہی۔ آکاش کے دیوتاؤں نے ان شردھالو برہمنوں کی پرارتھنا سن لی اور تیسرے دن سانڈجی مہاراج کی آتما شریر کے بندھن سے مکتی پا گئی۔ اب سانڈجی کی ارتھی تیار ہوئی۔ اور سینکڑوں استری، پرشوں کے جلوس کے ساتھ دریا کے کنارے لاش دفن کی گئی۔

یہ واقع بالکل سچا ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کسی پرانے زمانے کا قصہ نہیں۔ بلکہ یہ واقعہ ۳ر مئی ۱۹۳۹ء کو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں پیش آیا ہے۔ اور اخبار نیشنل کال نے اپنی ۴ر مئی کی اشاعت میں درج کیا ہے۔

اندازہ فرمایئے کہ اگر نبی اکرمؐ تشریف لاکر اس ظلمتکدۂ عالم میں علم و بصیرت کی ضیا پاشیاں نہ فرماتے تو آج دنیا کہاں ہوتی، اور کیا ہوتی؟

حدیثِ الم

سابقہ پرچہ میں ہم نے تحریک مدح و تبرا کے متعلق جس دھڑکتے ہوئے دل۔ لرزتی ہوئی انگلیوں، اور جھکی ہوئی نگاہوں سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اس کا احساس اس وقت تک ہمارے لئے سوہانِ روح بن رہا ہے لیکن اس

ایک ماہ میں لکھنؤ میں جو کچھ اور گذری۔ وہ اس سے بھی زیادہ الم انگیز اور دلخراش ہے، ہر چند اس سانحہ جگر سوز کا ہر منکڑہ عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن اس میں ایک منظر ایسا آتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر شاید ہی کوئی حساس مسلمان ایسا ہو جو اپنی گردن اوپر اٹھا سکے۔ تنازعہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں ہے۔ اس کا فیصلہ مسلمانوں ہی کی ایک تیسری جماعت کرا سکتی ہے۔ اگر قوت ہو تو نہ ماننے والوں سے اس فیصلے کو بزور منوایا جائے گا۔ اور اگر آج بدبختی سے مسلمان قوت سے محروم ہے تو منت و سماجت سے لیکن بہر حال فیصلہ مسلمانوں ہی سے کرانا ہوگا مسلم لیگ بار بار کہہ رہی ہے کہ فریقین معاملہ اس کے ہاتھ میں دیدیں۔ لیکن کوئی نہیں مانتا۔ ایک صاحب کی تجویز ہے کہ جھگڑا ترکی اور ایران کے قونصل جنرلوں کو تفویض کر دیا جائے۔ لیکن کوئی کان نہیں دھرتا۔ یہ سب کچھ ناقابل قبول لیکن ہوتا کیا ہے؟ کبھی ہندو وزیر اعظم کے سنگِ آستاں پر جبہ سائی کی جاتی ہے کہ ہمارا فیصلہ کرا دیجئے۔ کبھی مسٹر بوس۔ سابق صدر کانگریس، کے حضور سپاسنامہ پیش کر کے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اگر آپ ہمارے حق میں فیصلہ دیدیں تو ہم کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ہر۔ ۵ رو ۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء)۔ اب بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس کے سامنے جھولی پھیلائی جاتی ہے۔ کہ حضور! ہماری سنئے!! (نیشنل کال ۱۳ر مئی)۔ اللہ اکبر۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو تمام دنیا کے جھگڑے مٹانے کے لئے آئی تھی۔ اور اس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتی رہے، آج اس قوم کی یہ کیفیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عروۃ الوثقیٰ کو چھوڑ کر طاغوتی قوتوں کے تار ہائے عنکبوت میں عافیت کوشی کے سامان تلاش کرتی ہے۔ توبہ! توبہ! جس قوم پر اللہ کا عذاب مسلط ہوتا ہے وہ کس درجہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ ذلت کی انتہا ملاحظہ ہو کہ برقعہ پوش مسلم خواتین کا ایک وفد، پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں حاضر ہو کر تصفیہ کی التجا کرتا ہے! (ہندوستان ٹائمز۔ ۹ مئی) يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

اے تحفظِ ناموسِ اسلام کے دعویدارو! تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا؟ کچھ تو ہوش میں آؤ! ذرا سوچو تو سہی کہ یہ "جنت" جوان داموں خریدی جا رہی ہے کس قدر گراں ہے۔ کیا تم اسلام کے تمام اہم ترین فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہو جواب اس "جہادِ عظیم" میں یوں مصروفِ سرفروشی ہو؟ پھر اگر تم نے یہ ٹھان ہی لی ہے کہ تمہیں، یوں آپس میں کٹ کر مرنا ہے۔ تو آپس میں لڑو، مرو، غیروں کے سامنے تصفیہ کے لئے کیوں جھولیاں پھیلاتے ہو؟ تم اپنی خود پیدا کردہ مصیبت میں کفار کے ہاں پناہ کے جویا ہو۔ حالانکہ تم ان مسلمانوں کی اولاد ہو کہ جب حضرتِ عاصم بن ثابتؓ ایک ٹیکرے پر کفار کے دو سو تیر اندازوں میں گھر گئے تو کفار نے کہا کہ نیچے اتر آؤ ہم تمہیں پناہ دیتے ہیں۔ تو انہوں نے صاف کہدیا کہ "میں کافر کی پناہ میں آنا نہیں چاہتا" اور وہیں لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ تم آج دوسروں سے اپنے فیصلے چاہتے ہو۔ اور اس کے بدلے میں انہیں یہ رشوت دیتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ مل جانے کو تیار ہیں۔ لیکن تم ان اسلاف کے نام لیوا ہو کہ جب حضرتِ کعب بن مالکؓ کو ایک فرد گذاشت کی پاداش میں جماعت نے بائیکاٹ کر دیا تو والیٔ خستان نے انہیں لکھکر بھیجا کہ تمہاری جماعت تمہارے ساتھ یہ سلوک کرتی ہے تو تم میرے پاس آجاؤ میں تمہیں اعلیٰ منصب عطا کرونگا خط پڑھکر حضرتِ کعبؓ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ خط کو تنور میں جھونک دیا اور کہا کہ اس مردود سے جاکر کہدو کہ آج تمہیں اتنی جرأت ہو گئی ہے! یہ تھے تمہارے اسلاف۔ اور یہ ہو آج تم۔ ؎

آپ ہی اپنے ذرا طرزِ عمل کو دیکھو
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمیں شملہ سے ایک شیعہ بھائی کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے شکایت کی ہے کہ طلوعِ اسلام نے مئی کے پرچہ میں مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں شذرہ

لکھکر اپنی روایتی غیر جانبداری کے اصول کو توڑ دیا ہے اور خواہ مخواہ شیعوں کی مخالفت کی ہے۔ ہم اپنے اس بھائی سے عرض کرینگے کہ وہ ذرا اپنی جنبہ داری سے الگ ہو کر مئی کے شذرہ کا بامعان مطالعہ فرمائیں اور سوچیں کہ اس سے سنیوں کی حمایت اور شیعوں کی مخالفت کا پہلو کیسے نکلتا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ طلوع اسلام شیعہ، سنی، وہابی، چکڑالوی کی الجھنوں سے بلند ایک خالص اسلامی ادارہ ہے جس کا مسلک حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت ہے۔ اس باب میں تو وہ مسلم و غیر مسلم کی تمیز کو بھی روا نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ شیعہ اور سنی کے امتیاز کو اپنے مسلک پر اثر انداز ہونے دے۔ مئی کا شذرہ۔ اور جو کچھ ہم اس وقت لکھ رہے ہیں۔ دکھے ہوئے دل کی آہیں ہیں جو ہر اس قلب حساس سے اٹھیں گی۔ جس میں افتراق بین الملت کے جگر سوز منظر سے اضطراب پیدا ہوگا۔

ہمارے اس بھائی نے لکھا ہے کہ شیعہ حضرات کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات تو طلوع اسلام نے شائع کر دیئے لیکن سنی اخبارات جو لکھ رہے ہیں اس کو بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص بھی شرافت کو چھوڑ کر سب و شتم پر اتر آئے۔ ہمارے نزدیک قابل مذمت ہے۔ خواہ وہ کسی جماعت سے متعلق ہو۔ لیکن برادر عزیز! اپنی غلط روش کے حق بجانب ہونے کے لئے یہ دلیل پیش کرنا کہ دیکھئے فریق مخالف کی بھی روش غلط ہے۔ دنیائے حق و انصاف میں جو وزن رکھتا ہے۔ ہر اہل بصیرت پر روشن ہے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقتباسات مذکورہ میں سے بعض غلط ہیں اور بعض تجویز یا تحریر چنانچہ مسلم لیگ میں شرکت کو حرام قرار دینے کے متعلق جو فتویٰ نقل کیا گیا تھا۔ اس کی تردید شمس العلماء مولانا ناصر حسین قبلہ مجتہد لکھنؤ کی طرف سے بتوسط جناب صدر شیعہ سٹوڈنٹس لاہور۔ پنجاب کے اخبارات میں ہو چکی ہے۔" یہ تردید ہماری نظروں سے نہیں گذری۔ اگر یہ صحیح ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن اس ایک اقتباس کے علاوہ اور کسی اقتباس کی تردید کے متعلق ہمارے بھائی نے کچھ نہیں لکھا۔ ہم پھر اس چیز کو دہراتے ہیں۔ اور اپنے اس

بھائی سے عرض کرتے ہیں کہ وہ ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ ہندوؤں سے یہ کہنا کہ وہ بیشک مساجد کے سامنے باجہ بجائیں۔ اور گائے کی قربانی کو قانوناً جرم قرار دیدیں۔ کسی صورت میں بھی کسی مسلمان کے شایان شان ہو سکتا ہے؟ یا یہ روش اختیار کرنا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنے تمام کاروبار ہندوؤں سے کئے جائیں۔ کوئی وجہ جواز اپنے اندر رکھتا ہے؟ اگر آپ یہ روش اختیار کرتے کہ سنیوں کا بائیکاٹ کرو، اور تمام کاروبار صرف شیعوں سے کرو۔ تو پھر بھی ایک بات تھی مسلمانوں کا بائیکاٹ کرنے اور ہندوؤں سے تعلقات قائم کرنا! یا للعجب۔

پھر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "شیعوں نے کبھی تبرا کی اجازت حاصل کرنے میں سبقت حاصل نہیں کی۔ جب تک کہ مقابل جماعت نے قدحِ اہلِ بیت بہ الفاظِ دیگر مدح صحابہ کی تحریک شروع نہیں کی۔ جب اس جماعت نے مدح صحابہ کی آڑ میں توہین ائمہ کی ٹھان لی۔ اور بازاروں اور گلی کوچوں میں اشتعال انگیز نظمیں پڑھنی شروع کیں، تو دفاعی طور پر تبرا ایجیٹیشن شروع کیا گیا۔ جو اس تباہ کن تحریک کو مٹانے کے لئے نہایت موزوں تھا"

حیرت ہے کہ ہم اس کے جواب میں کیا عرض کریں۔ اس لئے کہ ہم جو کچھ بھی عرض کریں گے، اسے پھر سنیوں کی طرفداری پر محمول کر لیا جائے گا۔ ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ مدحِ صحابہ سے قدح اہل بیت اور توہین ائمہ کس طرح ثابت ہو گئی! ذرا غور فرمائیے کہ مسلمان نبی اکرمؐ کو افضل الانبیاء اور خیر البشر قرار دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی عیسائی یہ کہے کہ حضورؐ کو افضل الانبیاء کہنے سے (نعوذ باللہ) حضرت عیسےٰ کی توہین ثابت ہوتی ہے اس لئے اس کے جواب میں ہم نبی اکرمؐ کو (معاذ اللہ) گالیاں دیں گے۔ تو آپ اس عیسائی کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ تم اپنے رسول کو افضل الانبیاء کہتے ہو ہم اپنے کو ایسا کہیں گے۔ تو لبسم اللہ۔ اس میں کسی دوسرے کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن حضورؐ کو افضل الانبیاء قرار دینے کے جواب میں (معاذ اللہ) حضورؐ کی شان میں گستاخی کے کلمات کس مسلک

کی رو سے جائز قرار پائیں گے۔

پھر آپ اپنے جوش میں اتنا بھی بھول گئے کہ مسلمان۔ اور سنی مسلمان۔ تو اس باب میں سخت مجبور واقع ہوا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہندو اس کے خدا کو (نعوذ باللہ) گالی دے، تو یہ اُس کے بتوں کو گالی نہیں دے سکتا۔ کہ قرآنِ کریم میں اس کی ممانعت ہے۔ اگر کوئی عیسائی۔ اس کے رسولؐ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کے کلمات کہے تو یہ اس کے رسول کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اُن کی تعظیم اس کا جزوِ ایمان ہے۔ اور اگر کوئی شیعہ اِس کے اسلافؓ میں سے کسی کے خلاف تبرا کہے تو یہ اہل بیت میں سے کسی کے خلاف لب کشائی نہیں کر سکتا کہ یہ تو اپنی ہر نماز میں ان پر درود بھیجتا ہے۔ برعکس اس کے شیعہ حضرات نے اس کا اعلان کر دیا ہے (اور ہمارے اس بھائی نے اس کی تردید نہیں کی) کہ جس طرح بغیر کلمہ توحید کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تبرا کے بغیر کوئی شخص شیعہ نہیں ہو سکتا۔ اب فرمائیے کہ یہ الزام کہ مدحِ صحابہ کی آڑ میں سنی قدحِ اہل بیت اور توہین ائمہ کرتے ہیں۔ کس قدر زیادتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں تبرا کو "نہایت موزوں" تحریک قرار دینا کس قدر ستم ظریفی! یقین مانئے۔ ہم اندھا دھند نہ سنیوں کے طرفدار ہیں نہ شیعوں کے مخالف۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان حقائق کو کیسے چھپایا جائے! اور اگر حق گوئی کا نام تعصب ہے تو ہم اس الزام کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں۔

اخیر میں ہم اپنے اس بھائی پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے سابقہ شذرہ کو جس نصیحت پر ختم کیا تھا۔ کہ

ایکہ تشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

وہ خود اس امر پر گواہ ہے کہ اس نصیحت کے مخاطب شیعہ اور سنی دونوں فریق ہیں۔ ہمارا مقصد

وحید اجتماعیت اور مرکزیت ہے جس کی طرف ہم ملتِ اسلامیہ کے ہر فرقہ کو دعوت دیتے ہیں اور جو بھی اس کے خلاف ہو، اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ جب تک یہ سطور شائع ہوں اس وقت تک اس قضیۂ المیہ کا کوئی عمدہ فیصلہ ہو چکا ہو کہ ہم اس حدیثِ الم کو دہرانا نہیں چاہتے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس تفریق و تشتت کے احساس سے ہم پر کیا گذرتی ہے؟

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

باقی رہا مدح و تبرا کی دینی حیثیت کا مسئلہ، تو اس پر مفصل گفتگو کرنے کے لئے یہ موقعہ مناسب نہیں۔ آج طبائع میں اشتعال ہے۔ اگر فضا میں سکون پیدا ہو گیا۔ اور اس بحث میں ملتِ اسلامیہ کے لئے کوئی بہتری کی صورت نظر آئی تو پھر ان شاء اللہ اس پر تفصیلاً بھی لکھا جا سکتا ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اقبالؒ

حیدرآباد اور کشمیر

(از جناب "ایم۔ ایس۔ ٹی" صاحب)

(اس مضمون کی اشاعت سے ہمارا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ ہم حیدرآباد کی اس لئے حمایت کریں کہ اس کا فرمانروا ایک مسلمان ہے۔ اور کشمیر کی اس لئے مخالفت کریں کہ وہاں ایک ہندو راجہ برسرِ اقتدار ہے مقصد اس سے محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ آج ہندوؤں کی تنگ نظری تعصب اور کوتاہ نگہی کس طرح ہر اُس چیز کو جس کے ساتھ "مسلمان" کا لفظ چسپاں ہو۔ بدنام کرنے اور بالآخر مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ واقعات اِن کے خلاف جائیں۔ دلائل و براہین ان کے دعاوی کی تردید کریں۔ ہر صائب الرائے شخص ان کو غلطی پر قرار دے لیکن یہ اپنی طاقت کے نشہ میں اسقدر سرمست اور مسلم کُشی کے جذبہ سے اسقدر مغلوب ہو چکے ہیں کہ جائز اور ناجائز۔ غلط اور صحیح۔ حق اور ناحق کا امتیاز ہی اُنکی نگاہ سے اُٹھ چکا ہے۔ فرمائیے کہ ایسی قوم کے ساتھ دنیا میں کس طرح نباہ ہو سکتا ہے۔ طلوع اسلام)

حیدرآباد کی مجلس اتحاد المسلمین نے جن چھ مطالبات کا حال ہی میں اعلان کیا ہے اُن پر ہندو پریس بہت برافروختہ ہو رہا ہے اور مسلمانوں کو فرقہ پرست۔ رجعت پسند۔ تنگ نظر و متعصب کہکر کوس رہا ہے۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی ایک قریبی اشاعت میں ایک ہندو پروفیسر نے "حیدرآباد و کشمیر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر یہ قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ مسلمان ہر صوبے میں خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں فرقہ وارانہ تفوق چاہتے ہیں۔ یعنی بالفاظِ دیگر مسلم راج کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔

قبل اس کے کہ مجلس اتحاد المسلمین کے مطالبات کی معقولیت یا غیر معقولیت پر تبصرہ کیا جائے۔ میں نہایت دیانتداری سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اگر ان مطالبات کی تائید کرونگا تو اس لئے نہیں کہ یہ ایک اسلامی جماعت کے مطالبات ہیں مسلمان صرف حق کی حمایت کرتا ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ حق کس کی طرف ہے۔ اگر خود

اس کا اپنا بھائی حق پر نہیں ہے تو وہ اس کی بھی اسی طرح مخالفت کرے گا جس طرح اُس غیر مسلم کی جو برسر ناحق ہے۔ اس لئے میری یہ تنقید محض جذبۂ حق پرستی پر مبنی ہے۔ نہ کہ جنبہ داری پر۔ وَاللہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْدٌ ؕ

اس میں شک نہیں کہ حیدر آباد کے مسلمان اپنے سیاسی اقتدار کو جو انہیں صدہا سال سے حاصل ہے۔ کسی طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور وہ آخر وقت تک اُس کے تحفظ کے لئے کوشش کرینگے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ریاست کشمیر کے ہندو اپنے سیاسی تفوق کو بحال رکھنے کے لئے مسلمانانِ حیدر آباد سے بڑھکر سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں اور کیا کشمیری مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی اور اقتصادی پستی کی تمام تر ذمہ داری ریاستی ہندوؤں پر ہے جو ملازمت۔ تعلیم۔ تجارت کو اپنی اجارہ داری سمجھے ہوئے ہیں۔

ریاست کشمیر میں ڈوگرے راجپوت اور ہندو پنڈت تناسب آبادی کے لحاظ سے تین فیصدی سے بھی کم ہیں۔ لیکن سول اور فوجی ملازمت میں اُن کا تناسب ۹۰ فیصدی سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے برعکس حیدر آباد میں مسلمانوں کی ۱۰ فیصدی آبادی سول اور فوجی ملازمت میں ایک تہائی سے زیادہ حصہ کی مالک نہیں ہے۔ حالانکہ اسی ریاست میں ۵ فیصدی اونچی ذات کے ہندو ۶۰ فیصدی سے زیادہ آسامیوں پر قابض ہیں۔ کشمیری مسلمان کی اقتصادی و تعلیمی حالت ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے لیکن حیدر آباد میں ہندو رعایا کی حالت ہر لحاظ سے برطانوی ہند کے باشندوں کے برابر ہے۔ ریاست کی تمام تجارت صنعت و حرفت۔ زراعت پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اور مسلمان محض ملازمت پر انحصار رکھتے ہیں کشمیر میں ہندوؤں کی اقتصادی حالت حیدر آبادی مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ وہ علاوہ ملازمتوں پر قابض ہونے کے زراعت تجارت وصنعت و حرفت میں بھی اپنے تناسب آبادی کی نسبت بہت زیادہ حصہ کے مالک ہیں۔ ریاست حیدر آباد گذشتہ نصف صدی سے برطانوی ہند کی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرتی رہی ہے۔ زراعت صنعت و حرفت۔ وسائل آمدورفت۔ تعلیم و تجارت میں یہ ریاست ہندوستان کی بہترین ریاستوں میں شمار ہوتی ہے۔ موجودہ نظام کے تدبر و فراست سے ریاست کا نظم و نسق ایک مہذب و ترقی یافتہ ملک کے اصولوں کے مطابق ہے جس کی تعریف وائسرائے ہند نے بھی ایوانِ رانجگان کا افتتاح کرتے وقت بدیں الفاظ کی تھی۔ کہ حیدر آباد حُسن انتظام کے لحاظ سے ہندوستان کی ایک بہترین

ریاست ہے۔ ہندوستان کے دوسرے والیان کی طرح نظام نے کبھی اپنا روپیہ یورپ کی بے سود سیر و تفریح اور رنگین مشاغل پر صرف نہیں کیا۔ محنت۔ سادگی۔ فرض شناسی و ہمدردی موجودہ نظام کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہیں۔

رعایا کی بہبودی اور فارغ البالی کے لئے ملک میں کئی ایک مفید تجاویز نافذ ہو چکی ہیں۔ جن سے زمینداروں اور کسانوں کا طبقہ خاص طور پر مستفید ہو رہا ہے۔ آبپاشی کے جدید طریقوں سے اور پانی کے ذخائر بڑے بڑے تالابوں میں جمع کرنے سے ہزارہا ایکڑ زمین جو غیر مزروعہ حالت میں تھی زیر کاشت آچکی ہے۔ جس سے زمین کی پیداوار اور کسان کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ صنعت و حرفت کو فروغ دینے سے شہری آبادی کے لئے کام کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جا رہے ہیں۔ ریاست میں اس وقت ۵۵۰ کارخانے ہیں۔ شاہ آباد کا سمنٹ کا کارخانہ اور ریاست کی کوئلہ کی کانیں تمام جنوبی ہند کی ضروریات کو پورا کر رہی ہیں۔ آمدورفت کے وسائل اکثر دوسری ریاستوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ مندرجہ بالا امور میں اگر حیدرآباد کا کشمیر سے مقابلہ کیا جائے تو ہم بلا تأمل اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ مؤخرالذکر بہت پسماندہ ریاست ہے۔ کشمیر کا کسان غریب اور مفلوک الحال ہے۔ ہر سال ہزارہا کسان روزی کمانے کے لئے نقلِ وطن کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اُن کی زمین کی پیداوار کے مقابلے میں اُن پر ٹیکسوں کا بوجھ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ پنجاب کے شہروں میں مزدوری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور سال کا قریباً نصف حصّہ وطن سے باہر صرف کرتے ہیں تاکہ اسقدر روپیہ جمع کر سکیں کہ وہ زرِ لگان ادا کر سکیں۔ ریاست کی عمدہ زمینیں اور باغات ہندو جاگیرداروں کے قبضہ میں ہیں۔ مسلمان کسانوں کا بیشتر حصّہ زمین کا مالک نہیں ہے اور اُجرت پر کام کرتا ہے۔ صنعت و حرفت بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ کارخانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ وسائلِ آمدورفت میں ریاست نے تاحال کوئی قابلِ قدر ترقی نہیں کی۔ رقبہ میں ریاست کشمیر حیدرآباد کے برابر ہے لیکن ریل کے نام تک سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ریل کے نہ ہونے سے ملک کی تجارت کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ معدنیات با فراط ہیں لیکن اب تک اُن سے کام نہیں لیا گیا۔ مال اور اقتصادی لحاظ سے ریاست کے مسلمان باشندے ہندوستان کے دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں نہایت ہی ابتر حالت میں ہیں۔ جہالت و غربت میں

وہ ضرب المثل ہیں ۔ دیہاتوں میں سبز غلاظت و گندگی کے ڈھیروں کے کچھ نظر نہیں آتا ۔ ایک دفعہ جو لباس ایک شخص کو میسر ہوتا ہے وہ بلا مبالغہ مہینوں تک تبدیل نہیں ہوتا ۔ یوں تو کشمیر کو جنت نظیر کہا جاتا ہے اور اُس کے دلکش نظاروں ۔ چراگاہوں اور سبزہ زاروں چشموں اور باغات کی تعریف میں پُل باندھے جاتے ہیں لیکن ریاست کی بدانتظامی کے باعث غریب رعایا امن و چین کی زندگی سے محروم ہے ۔ اور اپنی روزی کمانے کے وسائل پر پوری طرح قادر نہیں ہے ۔ مذہبی آزادی بھی ریاست میں برائے نام ہے ۔ جسقدر مذہبی پابندیاں کشمیر کے مسلمانوں پر عائد ہیں اُنکا عشر عشیر بھی کسی اسلامی ریاست میں ہندو رعایا پر کبھی عائد نہیں کی گئیں وہاں گائے کے ذبح کرنے کی قطعی ممانعت ہے ۔ اگر کوئی مسلمان عید الضحیٰ کے موقعہ پر بھی گائے کی قربانی کرے یا بھوے بھٹکے گائے کا گوشت کھالے تو اُسے سات سال قید با مشقت کی سزا بھگتنی پڑتی ہے ۔ اُن خالص اسلامی گاؤں اور بستیوں میں بھی جہاں کسی ہندو کا نام و نشان نہیں ملتا مسلمان ذبیحہ گائے کے حق سے محروم ہیں ۔ چند سال ہی کا ذکر ہے کہ ایک مسلمان کو گائے کی قربانی کرنے پر سات سال قید کی سزا ہوئی تھی ۔ لیکن ہائیکورٹ میں اپیل کرنے پر سزا کم ہوگئی تھی ۔ محض اتنی سی بات پر ریاستی ہندوؤں کی طرف سے ایک عام شورش برپا ہوئی ۔ ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی گئی ۔ مظاہرے اور کانفرنسیں ہوئیں ۔ آخر کار مہاراجہ صاحب کو ہائی کورٹ کے فیصلہ کی نگرانی کرنی پڑی اور سزا بحال رکھی گئی ۔ مذہبی تبلیغ پر بھی ہندوؤں کی حمایت میں پابندیاں عائد ہیں ۔ اگر کوئی ہندو مذہب اسلام قبول کرلے تو اُس کو جائداد کی وراثت سے محروم کردیا جاتا ہے ۔ اسی پر بس نہیں بلکہ وہ اپنے بیوی بچوں کی کفالت و سرپرستی سے بھی علیحدہ کردیا جاتا ہے ۔

ملازمتوں میں ریاست کے مسلمانوں کا حصہ ۱۰ فیصدی سے بھی کم ہے ۔ حالانکہ ان کا تناسب آبادی ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہے ۔ اس کے برعکس حیدرآباد میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۰ فیصدی ہے ۔ ملازمتوں میں ان کا حصہ ریاستی ہندوؤں کے نصف سے بھی کم ہے ۔ ریاست کشمیر نے آج تک وزیر اعظم کے عہدے پر کسی مسلمان کو سرفراز نہیں کیا ۔ لیکن اس کے برعکس حیدرآباد میں ایک طویل مدت تک قلمدانِ وزارت مہاراجہ سرکشن پرشاد کے سپرد رہا ۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے لحاظ سے ریاست کے تمام باشندوں بر فوقیت

رکھتے تھے کیا ریاست کشمیر میں کسی ایک مسلمان کا نام لیا جاسکتا ہے جو اپنی دولت وثروت اثر ورسوخ کے لحاظ سے مہاراجہ کشمیر کے بعد ریاست کا سب سے بڑا رکن سمجھا گیا ہو۔

حیدرآباد میں سینکڑوں ایسے ہندو امراء اور رؤسا ہیں جو بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہیں۔ جنکی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے سے زائد ہے۔ لیکن اس کے برعکس چند مسلمان بھی نظر نہ آئیں گے جو ریاست کشمیر کے بڑے جاگیرداروں میں شمار کئے جاسکیں۔

اب میں مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کے ان چھ مطالبات کو پیش کرتا ہوں جو ہندو پریس کی نکتہ چینی وبرافروختگی کا باعث ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو مطالبات میں حیدرآبادی مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور میونسپل کمیٹیوں میں ان کے تناسب آبادی سے زیادہ حقوق طلب کئے گئے ہیں۔ تیسرے مطالبے میں حکومتِ نظام کی توجہ اختیاراتِ خصوصی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ ہوسکے۔ مضمون کی طوالت کے باعث میں ان تینوں مطالبوں کو نظرانداز کرتا ہوں۔ البتہ ان کے متعلق عام مسلمانوں کا نظریہ پیش کرنے کے لئے مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی سند پیش کرتا ہوں۔ جس میں نہ صرف مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا ہے بلکہ ریاست کے لاکھوں پسماندہ باشندوں کی نمائندگی کے لئے بھی زور دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے جور وستم سے نجات پائیں۔ جو کہ اس وقت دیہاتوں میں تمام تعلیمی وانتظامی امور پر حاوی ہیں۔ ریزولیوشن یہ ہے:۔

"چونکہ کانگریس اور اس کے حواریوں نے تمام ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے لئے ایک منظم تحریک شروع کردی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک میں انقلابی رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور چونکہ کانگریس مسلمانوں کے جائز اور صحیح حقوق کو نظرانداز کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کا یہ اجلاس حضور نظام کی حکومت سے یہ امید رکھتا ہے کہ جہاں وہ دکن کے مسلمانوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کرینگے وہاں ان کا یہ بھی فرض ہے کہ آئندہ اصلاحات نافذ کرتے وقت ریاست کے لاکھوں پسماندہ باشندوں کو مناسب نمائندگی دینگے اور اس امر کے لئے کوشش کرینگے کہ لاکھوں بے زبان ادنیٰ

جاتی کے لوگوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلائینگے۔ جو کہ اس وقت مملکتِ نظام میں تمام دیہاتی علاقوں میں انتظامی و تعلیمی اختیارات کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔"

باقی تین مطالبوں میں سے ایک فیڈریشن میں مشروط شمولیت کے متعلق ہے۔ یہ مطالبہ درحقیقت ایک مشورے کی صورت میں ہے جس پر دوسری ریاستیں بھی غور کر رہی ہیں۔ ریاستی مسلمان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جب تک فیڈریشن میں ریاست کے جملہ حقوق و اختیارات کے تحفظ کا یقین نہ دلایا جائے ریاست کو فیڈرل نظام میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ ابھی تک اس مسئلے پر ایوانِ راجگان میں کوئی قطعی و آخری فیصلہ نہیں ہوا۔

حیدرآبادی مسلمانوں کا یہ مطالبہ درحقیقت مسلم لیگ کی تائید میں ہے۔ جو شروع سے ہی فیڈریشن کی اس بنا پر مخالفت کر رہی ہے کہ مرکز میں کل نشستوں کا ½ حصہ مسلمانوں کو دیا جائے اور صوبجات کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دئے جائیں۔ اگر کانگریس ریاستی نمایندوں میں نشستوں کا ½ حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص کردے تو مسلم لیگ اور اس کے مابین بہت جلد تصفیہ ہوسکتا ہے۔ اور مسلمانانِ حیدرآباد سے بھی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ رویہ کو تبدیل کردیں۔

پانچویں مطالبہ میں مجلس اتحاد المسلمین نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اردو کا درجہ بدستورِ سابق بطور درباری زبان کے جاری رہے گا۔ اور تمام تعلیمی اداروں میں بجز پرائمری مدارس کے ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔ اردو زبان ریاست کے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان ہے۔ اس کی موجودہ حیثیت سالہا سال کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ اردو کو سمجھنے والے اشخاص ہزارہا کی تعداد میں موجود ہیں۔ اگرچہ ریاست کے دیہاتی باشندے مختلف دیسی زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی زبان بھی اسقدر جامع و ہمہ گیر ثابت نہیں ہوئی کہ سارے ملک کی عام زبان کا درجہ حاصل کرسکے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے ریاست کے باشندوں میں اعلیٰ تعلیم کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں بہت بڑی شاندار خدمت کی ہے۔ اردو زبان کی وساطت سے مختلف علوم و فنون میں جسقدر تصنیفات اور

تالیفات شائع ہوئی ہیں اس کی نظیر ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں نہیں ملتی۔ حقیقت میں نظام حیدرآباد نے ایک بہت بڑا فرض ادا کیا ہے ایک ایسی سرزمین میں جو مختلف زبانوں کی آماجگاہ ہے۔ وہاں ایک عام زبان کو جاری کرکے تعلیم یافتہ طبقہ کو متحد الخیال کردیا ہے۔ ریاستی باشندوں کی طرزِ معاشرت ان کے لباس اور مجالس و مشاغل سے ان کی ہم مذاقی اور ہم آہنگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر مدراس کا وزیر اعظم اپنے صوبے میں جہاں پر اس وقت مختلف زبانیں رائج ہیں ہندی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے محض اسلئے کہ وہ صوبے کے سب لوگوں کی عام زبان کا درجہ حاصل کرسکے تو کوئی وجہ نہیں کہ مملکتِ نظام میں اردو کو عام زبان ہونے کے حق سے محروم کیا جائے۔ اگر ہندی ان صوبوں میں رائج کی جاسکتی ہے جہاں پر یہ پہلے نہ کبھی بولی گئی اور نہ لکھی گئی تو یقیناً اردو کو زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اُس علاقے میں جاری رہے۔ جہاں وہ پہلے ہی درباری زبان ہے اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہوگی کہ ریاست کے باشندوں کو ایک ایسی زبان کے پڑھنے سے روکا جائے جو ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ ترقی پذیر جامع و ہمہ گیر ہے۔

روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں ایک ہندو پروفیسر نے اپنے مضمون زیرِ عنوان "حیدرآباد دکشمیر" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اگر مسلمان حیدرآباد میں اردو کی ترویج پر زور دینگے تو پھر کشمیر کے ہندو بھی یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ ڈوگری ان کے ملک میں درباری زبان قرار دی جائے۔

تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب اردو کا مقابلہ ایک ایسی غیر معروف زبان سے کر رہے ہیں جو ابھی تک حیطۂ تحریر میں نہیں آسکی اور جس کی صرف و نحو شاید پروفیسر صاحب کے سوا کسی اور کے علم میں نہ ہو اگر ڈوگری زبان جو کہ ریاست کشمیر کے چند لاکھ ڈوگرہ راجپوتوں کی مقامی بولی ہے اردو کی طرح ہمہ گیری اور جامعیت کی صفات کی حامل ہے تو مسلمانوں کو اس کے استعمال کرنے میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن واقعاتِ موجودہ ثابت کر رہے ہیں کہ ڈوگری زبان اپنے ملک میں یتیم و لاوارث کی حیثیت سے ہے۔ نہ اس کو ریاست میں درباری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے اور نہ ہی یہ کالجوں اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ نظم و نثر، ڈرامہ اور مکالمہ انشا پردازی اور مضمون نگاری سے اب تک یہ زبان قطعاً محروم ہے

ان حالات میں دوگری زبان کا اردو کے مقابلہ میں پیش کرنا ہندو تعصب اور تنگ نظری کی ایک بین دلیل ہے۔

مجلس اتحاد المسلمین کا آخری مطالبہ اوقاف کی نگرانی کے متعلق ہے لیکن اس سے ہندو اخبارات نے یہ مراد لی ہے کہ آئندہ ریاست میں ہندوؤں کو مندر بنانے کی اجازت نہ ہوگی اور ان کے مذہب پر پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ ہمارے کرم فرما ہندو پروفیسر صاحب نے یہاں تک کہدیا ہے کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اور وہ اپنی مذہبی رسومات کامل آزادی کے ساتھ ادا نہیں کرسکتے اس کے ثبوت میں آپ نے آریہ سماج تحریک پر پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تردید کے لئے مہاراجہ سرکشن پرشاد کا وہ بیان ہی کافی ہے جو انہوں نے حال ہی میں اخبارات کو بھیجا ہے۔ اس بیان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان صدہا سال سے باہمی رواداری اور امن کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ ہندو مسلم منافشت آجتک وہاں پیدا نہیں ہوسکی۔ ہندوؤں کو ہمیشہ کامل آزادی حاصل رہی ہے۔ موجودہ فتنہ فساد کی تمام تر ذمہ داری انہوں نے آریہ سماج پر ڈالی ہے۔ جن کی دریدہ دہنی اور گستاخی سے سناتنی ہندو بھی نالاں ہے۔ اس بیان کے بعض حصے نقل کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین خود صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

"حیدرآباد کی موجودہ شورش ان تحریکوں اور مظاہروں کی صدائے بازگشت ہے جو حیدرآباد سے باہر برطانوی ہند میں جاری کی گئیں اور جو فرقہ دارانہ رنگ میں ریاست کے لوگوں کی زندگی امن اور خوشحالی کو معرض خطر میں ڈال رہی ہیں۔ حیدرآباد فرقہ دارانہ شورش سے ہمیشہ بری الذمہ رہا ہے چونکہ ہندو ہمیشہ مذہبی رواداری صلح و آشتی و ہمدردی کا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ ہندوؤں کو بطور ہندو ہونے کے آج بھی نظام کی حکومت کے خلاف کوئی جائز شکایت نہیں ہے۔"

مہاراجہ نے آریہ سماج کو شورش کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ سناتن دھرم کے دشمن ہیں۔ سناتن دھرم کے پیروکار یہ سننا گوارا نہیں کرسکتے کہ آریہ سماجی کس قدر ناشائستہ الفاظ سری کرشن مہاراج کی نسبت استعمال کرتے ہیں۔ بیان کو جاری رکھتے ہوئے مہاراجہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں برطانوی ہند کے اخبارات میں پڑھتا ہوں کہ حیدر آباد میں ہندوؤں سے بدسلوکی کی جاتی ہے۔ ان کی مذہبی آزادی اور شہری حقوق پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ یہ ایک نہایت غلط اور گمراہ کن تصویر ہے۔"

آخیر میں آپ فرماتے ہیں :-

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حیدر آباد کے تمام اقتصادی ذرائع ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں۔ زراعت۔ تجارت۔ صنعت وحرفت۔ بنک اور ساہوکارہ کا کام ہندوؤں کی اجارہ داری میں ہے"

اس بیان کے پڑھنے کے بعد ایک صائب الرائے انسان یہ کہنے پر مجبور ہے کہ حیدر آباد کے خلاف موجودہ شورش محض آریہ سماج کی تنگ نظری اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ حیدر آباد کے باشندوں کی مذہبی آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ آریہ سماج کی دریدہ دہنی اور ان کے اشتعال انگیز پروپاگنڈا کی روک تھام کی گئی ہے تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت نہ پھیل سکے اور دونوں قوموں کے تعلقات حسب سابق خوشگوار اور دوستانہ رہیں۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ ہندو اخبارات میں الزام لگایا گیا ہے کہ مسلمان خواہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں مسلم راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لئے مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ تو مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت ہی اس کا کافی جواب ہوسکتی ہے۔ برطانوی ہند کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں مسلمان ایک حقیر اقلیت میں ہیں اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ہندو اکثریت کے رحم پر ہیں۔ دو صوبوں میں بالخصوص یعنی اڑیسہ و صوبجاتِ متوسط میں مسلمانوں کی قطعاً کوئی شنوائی نہیں ہے۔ اور نہ ہی وزارت میں ان کی نیابت ہے۔ ان ہر دو صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن ان کو وزارت کے قابل نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس کے برعکس صوبۂ سندھ و سرحد میں ہندوؤں کی آبادی ۱۲ لاکھ کے قریب ہے لیکن ان ہر دو صوبوں میں ہندوؤں کو وزارت میں کافی نیابت دی گئی ہے۔ باقی چار صوبوں میں

جہاں مسلمان کی اکثریت ہے وہاں پر تعلیم۔ تجارت۔ دولت و دیگر اہم امور میں ہندوؤں کے تفوق سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار معرضِ خطر میں ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی اقتصادی حالت ہندوؤں کے ہم پلّہ نہ ہوگی۔ اُن کا سیاسی اقتدار برائے نام رہیگا۔

مسلمانوں کی اسی اقتصادی بدحالی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے لئے یہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ کہ ان صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے وہ کس طرح اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ مسلمان اپنے مذہب کی رُو سے ہمیشہ انصاف اور رواداری کا پابند ہے۔ اسی لئے وہ ہندو سے تصفیہ کرتے وقت محض اپنے جائز حقوق کے تحفظ کا خواہشمند ہے۔

تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک میں نو کروڑ آبادی اقلیت قرار دی گئی ہو۔ اور محض چند تحفظات کی بنا پر اس کو اپنی زندگی سے مطمئن کر دیا گیا ہو۔ یہ سراسر ظلم ہے کہ جب مسلمان اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کریں تو ان پر یہ الزام لگا دیا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ تفوق چاہتے ہیں۔ مسلمان ہندوستان کے دو مخصوص حصوں میں شمال مشرق میں بنگال اور آسام۔ اور شمال مغرب میں پنجاب کشمیر۔ صوبۂ سرحد۔ سندھ و بلوچستان میں غالب اکثریت میں ہیں۔ ان ہر دو حصوں کی کل آبادی ان کی ہندوستان کی کل مسلم آبادی کے برابر ہے۔ اس لئے اگر ان ہر دو حصوں میں مسلمانوں کو حقِ خود اختیاری حاصل ہو جائے۔ اور کانگریس ان کے سیاسی تفوق اور مکمل آزادی کو تسلیم کرلے تو ہندو مسلم جھگڑا مستقل طور پر ختم ہو سکتا ہے۔

معذرت

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ "اسلامی معاشرت" کی طبع ثانی میں معمول سے زیادہ تاخیر ہو گئی ہے اس لئے بعض کرمفرماؤں کی پے در پے یاد دہانیوں کے باوجود تعمیلِ ارشاد نہ ہو سکی۔ اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اور امید ہے کہ انشاء اللہ "اسلامی معاشرت" مستقبل قریب میں تیار ہو جائے گی۔ (منیجر)

خاتونِ حرم

(اسد ملتانی)

اللہ کی رحمت ہے خاتونِ حرم! تجھ پر
عصمت ہے ترا جوہر، عفّت ہے ترا زیور

تُو شرم کی ہے پُتلی، ہے تیری نظر نیچی
غمزہ بھی وقار افزا، شوخی بھی حیا پرور

پاکیزگیٔ دل کا پرتو تری آنکھوں میں
باطن کی صفائی کا آئینہ رُخِ انور

اک حُسن ہے جسمانی اک حسن ہے روحانی
یہ جلوۂ نورانی وُہ شُعلۂ خاکستر

رنگ آ ہی نہیں سکتا پاکیزہ جمالی کا
بیباک نگاہوں سے روندے ہوئے چہرے پر

رُتبے سے ترے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی
مغرب کی پری پیکر، بے پردہ و بے شوہر

ہے نشو و نما اس کی تاثیر سینما سے
اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے ترا پیکر

تُو باپ کا سرمایہ، بھائی پہ اثر تیرا
شوہر کی ہے تو ہمدم، بچّوں کی ہے تُو رہبر

بے شک تری جلوت سے محروم ہیں نامحرم
خلوت ہی میں رہ کر تُو ملّت کی ہے صورت گر

آئینۂ قرآں میں دیکھ اپنی اداؤں کو
شانہ تری زلفوں کا فرمودۂ پیغمبرؐ

اندرونِ ہند

INSIDE INDIA

۱۹۳۵ء میں جب ترکی کی نامور خاتون محترمہ خالدہ ادیب خانم۔ جامعہ ملّیہ میں توسیعی لکچروں کے سلسلہ میں تشریف لائیں۔ تو ایک بحث کے دوران میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے ضمنی طور پر فرمایا تھا کہ ممالکِ اسلامیہ سے کوئی شخص آئے۔ ہندوستان کے مسلمان سمجھ لیتے ہیں کہ وہ علومِ اسلامیہ کا فاضلِ اجل ہے اور فلسفۂ اسلام کے متعلق اس کا ہر لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالانکہ تعلیمِ اسلام کے متعلق ان میں سے اکثر کی معلومات بالکل سطحی حیثیت کی ہوتی ہیں۔ اور انکی بین الاقوامی شہرت دیگر وجوہات کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اُس وقت ہم اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکے کہ حضرتِ علامہؒ کا اس سے مفہوم کیا ہے۔ لیکن اب بات سمجھ میں آئی کہ "سطحی معلومات" سے ان کا مطلب فی الواقعہ **سطحی معلومات** ہی تھا۔ خاتونِ محترمہ نے ہندوستان کے احوال وظروف اور اپنے تاثرات کو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں قلمبند فرمایا ہے جو "اندرونِ ہند"[1] (Inside India.) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ بحیثیت مصنف وخطیب۔ خاتونِ موصوفہ شہرتِ دوام کی مالک ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش قابلِ رشک اور اندازِ بیان وجد آفریں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ہم ایسی جلیل القدر مصنفہ کی اسلام کے متعلق معلومات دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے کتاب مذکور کا انگریزی ایڈیشن ہے۔ جس میں سے چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) صـ۹۱ کے فٹ نوٹ میں تحریر ہے۔

"محرم کے مہینے۔ نبی اکرمؐ کے نواسے۔ (امام) حسنؓ اور (امام) حسینؓ۔

---

[1] ۔ انگریزی کتاب کا ترجمہ "اندرونِ ہند" کے نام سے جامعہ ملیہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

کربلا کے میدان میں شہید کیے گئے تھے۔"

یعنی شہدائے کربلا میں امام حسینؓ کے ساتھ امام حسنؓ بھی شامل کر دیے گئے۔

(۲) صفحہ ۱ پر حضرت عمرؓ کو خلیفۂ چہارم بتایا گیا ہے۔

یہ تو تاریخ اسلام کے متعلق تھا۔ اب قرآن کریم کے متعلق معلومات کا اندازہ فرمائیے۔ جب خاتونِ محترم پشاور کالج میں لکچر کے لیے تشریف لے گئیں تو حسب معمول لکچر سے پیشتر قرآن کریم کی تلاوت ہوئی۔ آپ تحریر فرماتی ہیں :-

"سرحد کے اس کالج میں (جو آیات تلاوت کی گئیں ان میں) سے دو آیات مجھے (اس وقت تک) یاد ہیں۔ جو زندگی کے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ کی صحیح ترجمانی کرتی تھیں۔ یعنی — سادہ لیکن قابلِ عمل اور تدبر شعار" صفحہ ۱۵۲

اب سنئے وہ آیات کونسی ہیں۔

" وہ آیات یہ ہیں -(۱) رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ ۔ اور

(۲) لا یکلف اللہ نفسًا وسعھا" (ایضًا)

انہیں اتنا بھی علم نہیں کہ رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ۔ قرآنِ کریم کی آیت نہیں۔ دوسری آیت میں نفسًا اور وسعہا کے درمیان لفظ اِلّا غائب ہے۔ یہ تو شاید سہوِ کتابت ہو۔ لیکن پہلی "آیت" کے متعلق کیا کہا جائے !

اب یہ دیکھئے کہ ایک سچے مسلمان کے متعلق ان حضرات کا تخیل کیا ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں

"جامعہ (ملیہ) اپنی تعلیم کی بنیاد مذہب پر رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خود بھی ایک مذہب پرست انسان ہیں۔ اگرچہ اس کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ وہ ایک عملی مسلمان ہیں۔ وہ نہ تو سور کا گوشت کھاتے ہیں۔ نہ شراب پیتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ ہر روز مسلمانوں کے طریق کے مطابق نماز پڑھتے ہیں۔" صفحہ ۱۰۱

ہر چند یہ احساس ہمارے لئے بیحد جگر خراش ہے لیکن یہ بیان اس امر کی صاف غمازی کر رہا ہے کہ ان ممالکِ اسلامیہ میں ایک مسلمان کی تعریف سمٹ سمٹا کر کس درجہ تنگ دائرہ میں محدود ہو چکی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک ایک مسلمان کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ لحمِ خنزیر اور شراب کا استعمال نہ کرے اور نماز پڑھ لے اور بس!

جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

اب ذرا اس سے اونچی سطح پر چلیئے۔ دہلی اسٹیشن پر ان کا استقبال اللہ اکبر کے نعروں سے ہوا۔ اس کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"ہندوستان میں اس نعرہ سے اظہارِ مسرت مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں اس سے مفہوم نماز کے لئے دعوت (اذان) ہے۔ یا جنگِ دست بدست میں ایک سپاہی کا نعرہ۔ "خدا بڑا ہے" یعنی وہ سپاہی چونکہ موت کا سامنا کرنے جا رہا ہے۔ اس لئے خدا سے حفاظت کا طالب ہے۔ یا شاید یہ نعرہ عفو خواہی کا مفہوم لئے ہوئے ہے کیونکہ وہ سپاہی اپنے ایک ہم جنس کو قتل کرنے جا رہا ہے۔" صـ۲۲

مسرت کے مقامات پر اللہ اکبر کا نعرہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ طریقِ حسنہ خود نبی اکرم صلعم کے عہد ہمایوں سے رائج ہے۔ جب حضرت عمرؓ ایمان لائے ہیں تو نبی اکرمؐ نے بیساختہ نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ان کے ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے ملکر اس زور سے اللہ اکبر کہا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ (طبقات ابن سعد وغیرہ) باقی رہا ایک مردِ مجاہد کا میدانِ جہاد میں نعرۂ تکبیر۔ سو اس کی علتِ غائی بالکل واضح ہے مسلمان کے اعمالِ صالحہ۔ اس کی زندگی۔ اس کی موت۔ سب اس لئے ہیں کہ دنیا میں اس کے اللہ کا نام بلند ہو (لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ)۔ جہاد تمام اعمالِ صالحہ کا سرتاج اور ایک مردِ مومن کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اُس وقت جب وہ شمشیر بدست میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہوتا ہے تو ساری دنیا کو علانیہ سُنا دیتا ہے کہ میرا یہ عمل نہ کسی ذاتی جذبۂ انتقام کی بنا پر ہے اور نہ ہی کسی اپنی منفعت کی خاطر۔ نہ یہ حصولِ ملوکیت کے لئے ہے اور نہ ہی جوعُ الارض کی تسکین کی غرض سے۔ بلکہ یہ محض اس لئے ہے کہ دنیا میں اللہ کا نام بلند ہو۔ اس زمین پر اس کی

حکومت کا تخت بچھے۔ ہر تکبر و نخوت کے پتلے کا غرور ٹوٹے اور وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کے برابر سمجھے یہ ہے مفہوم ایک مردِ مجاہد کی اُس تکبیر کا جو اس کائنات میں عدل و انصاف کی علمبردار اور شرفِ انسانیت کی بقا کی ضامن ہے۔ اور جس تکبیر کے گم ہو جانے سے آج دنیا اضطراب و عدمِ سکون کے جہنم میں اور خود مسلمان ذلت و خواری کے عمیق گڑھوں میں گر چکے ہیں۔

ایک جگہ چودھری رحمت علی صاحب۔ بانی تحریک پاکستان۔ کی ایک ملاقات کا حال لکھا ہے۔ جس کے دوران میں فرمایا ہے۔

"یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کے ابتدائی (تعلیمی) اثرات نے انہیں مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دینے پر آمادہ کر لیا"۔ صفحہ ۳۵۱

یعنی مصنف کے نزدیک اسلام میں مذہب اور قومیت الگ الگ شعبے ہیں۔ یہ یونہی خارجی اثرات تھے جن کی وجہ سے چودھری رحمت علی صاحب نے یہ مسلک اختیار کر لیا۔ یہ ہے مصنف کی اسلامی سیاست سے واقفیت۔

کتاب میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳۴ پر مسز آصف علی صاحبہ کے متعلق لکھا ہے کہ۔ "وہ ایک ہندو عورت ہے جس نے مسلمان سے شادی کی ہوئی ہے"۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مسز آصف علی صاحبہ نے شادی سے پیشتر اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک ہندو ہیں۔ کیا مسٹر آصف علی صاحب اس کے متعلق صحیح واقفیت بہم پہنچائیں گے؟ اور اگر مسز آصف علی کے متعلق محترمہ خالدہ ادیب خانم کا یہ بیان درست ہے تو کیا مفتی کفایت اللہ صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ ایسی شادی کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے؟

ایک جگہ سید سلیمان ندوی صاحب کے متعلق تحریر ہے کہ

"وہ اسلام میں مذہب کو سیاست (Church and State) سے الگ

کر دینے کے بھی قائل ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ یہ تفریق کسی بین الملّی جماعت کی منظوری سے ہونی چاہیئے۔ کسی ایک اسلامی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے"۔

کیا سید صاحب فرمائیں گے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی تفریق کے متعلق فی الواقعہ ان کے یہی خیالات ہیں؟

بیگم انصاری مرحومہ کے پردے کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"انہوں نے سوائے اپنے رشتہ داروں کے۔ اور مہاتما گاندھی کے کسی (بیگانے) مرد کو کبھی نہیں دیکھا تھا" ص۳۱

مرحومہ (خدا غریقِ رحمت کرے) فی الواقعہ پردے کی بڑی پابند تھیں۔ لیکن۔ اگر مذکورہ صدر بیان صحیح ہے تو اس سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات مہاتما گاندھی کو عام انسانوں سے کس قدر بلند سمجھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ محترمہ خالدہ ادیب خانم۔ جو اپنے قیام ہندوستان کے دوران میں قومیت پرست حضرات کے حلقۂ اثر میں رہیں۔ اور اسی ماحول سے وہ متاثر ہوئیں۔ ان کے نزدیک بھی مہاتما جی ایک مافوق البشر ہستی نظر آتے ہیں۔ یہ بات ان کی کتاب کے ایک ایک صفحہ سے عیاں ہے۔ اور انہوں نے مہاتما جی کو اتنی بلند سطح پر بٹھا رکھا ہے کہ ان کا کوئی بڑے سے بڑا عقیدتمند بھی شاید ہی انہیں وہ مقام دے سکے۔ دنیا میں عظیم المرتبت انسانوں کی اقسام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتی ہیں۔

"ایک دوسری قسم کے عظیم المرتبت انسان (مہاتما) بدھ اور (حضرت) مسیحؑ ..... ہیں اور مہاتما گاندھی اسی صنف میں شمار ہوتے ہیں" ص۳۲

مہاتما گاندھی کو اس زمرہ میں شمار کر لینا جس میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام جیسے رسول شامل ہیں۔ ایک مسلمان کے قلم اور زبان سے تو کبھی زیب نہیں دیتا! تعریف کرنے کے کئی اور طریقے ہو سکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کو اپنے ایمان کی طرف بھی تو نگاہ رکھنی چاہیئے۔ لیکن مصنفہ کی عقیدت تو ان سے یہاں تک

کہلوا رہی ہے کہ :-

"اس وقت مہاتما گاندھی نے میرے اس عقیدہ کی تجدید کرادی کہ بہترین قسم کا انسان فی الواقعہ منزہ عن الخطا رہوتا ہے۔" ص۸۴

مہاتما جی کے چیلوں نے تو کہیں ۱۹۳۹ء کی کانگریس کے جلسہ میں اس بات کا اعلان کیا کہ وہ منزہ عن الخطا اور ہر قسم کی لغزشوں سے معصوم ہیں۔ لیکن ہماری یہ اسلامی خاتون ان سے بہت عرصہ پیشتر اس بات پر ایمان لا چکی تھیں۔

اسی ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات نظر پڑی۔ فرماتی ہیں کہ

"مہاتما گاندھی کی اتباع میں ہندوستانیوں کو کسی دنیاوی مفاد کی توقع ہے ہی نہیں۔" ص۸۴

یعنی مہاتما گاندھی کی تحریک بالکل بے غرضانہ اور دنیاوی اغراض و مفاد سے یکسر الگ۔ خالصتہً روحانیت پر مبنی ہے۔ حیرت ہے کہ اسے مصنفہ کا تجاہلِ عارفانہ کہئے یا انتہائی ناواقفیت کی دلیل!

موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق یہ تنقید بھی قابلِ غور ہے۔

"علی گڈھ وہ پہلا اسلامی مرکز ہے۔ جہاں میں نے اس خطرہ کی آواز سنی کہ ہندوستان میں مسلمان اپنا ملّی تشخص کھو کر ہندوؤں (کی قومیت) میں جذب ہو جائینگے۔ میرا خیال ہے کہ اس عجیب سی نفسیاتی کیفیت کے لئے تنہا مسلمان ہی موردِ الزام نہیں قرار دئے جا سکتے۔ لیکن جس چیز کو میں قطعاً نہیں سمجھ سکی وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان کس طرح اس امر کا خیال بھی دل میں لا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہندو مت میں انجذاب و انہضام کی اس قدر غیر معمولی قوت کے باوجود۔ اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے جو ہندوؤں کے نظامِ زندگی میں شامل نہیں کیا گیا۔" ص۱۳۱

لیکن خاتونِ محترم کو اس بات کا علم نہیں کہ اسلام کے اسدرجہ محکم ہونے نے ہی ہندوؤں کے دل میں

اس کی طرف سے وہ جذبات پیدا کئے ہیں جو انہیں آج اس امر پر سربکف آمادہ کئے ہوئے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص مٹا دیا جائے۔ اگر مسلمان بھی ہندومت کے اندر اسی آسانی سے جذب ہوجاتے جس آسانی سے اور باہر سے آئی ہوئی قومیں اس "آکال الامم" نے ہڑپ کرلی تھیں۔ تو ہندوؤں کو اس درجہ سعی و کاوش کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ کانگریس کی شاطرانہ چالیں۔ یہ مہاتمانہ مکڑی کے جالے۔ یہ کسی بجاج اور برلا کی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیاں۔ یہ متحدہ قومیت کا دام ہمرنگِ زمین۔ یہ وارد ھا اسکیمیں۔ "یہ ہندی۔ ہندوستانی" کی بظاہر معصومانہ تدابیر۔ یہ بھائیوں کو بھائیوں سے الگ کرکے ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کے حربے۔ ان میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ اسلام تو یقیناً ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ کر لے آنے والا مذہب ہے۔ لیکن یہاں مقابلہ اسلام اور ہندومت کا نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ہے۔ اُن مسلمانوں کا جو عملاً اسلام کو چھوڑ کر محض مردم شماری کے رجسٹر کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ اگر ان میں اسلام کو زندہ نہ کیا گیا تو ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو یہاں کے کروروں اچھوتوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور اس خطرے سے بچنے کے لئے احیائے احساسِ ملی کی وہ کوششیں ہو رہی ہیں جسے آج "فرقہ پرستی" کا لیبل لگا کر اپنوں پرائوں میں بدنام کیا جاتا ہے۔

آخر میں "معلوماتِ عامہ" کی بھی ایک مثال سنئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی۔ دارالسلام واقع دریا گنج۔ دہلی کے متعلق لکھتی ہیں کہ۔

> " یہ وہ کوٹھی ہے جہاں ایک قابلِ یاد موقعہ پر لارڈ ارون مہاتما گاندھی سے آکر ملے تھے۔" ص ۲۷

معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خاتونِ محترمہ کے گرد و پیش رہتے تھے وہ کانگریس اور مہاتما گاندھی کی عظمت کے متعلق انہیں طرح طرح کے افسانے سناتے رہتے ہونگے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہوگا کہ وائسرائے ہند۔ لارڈ ارون۔ گاندھی جی کی ملاقات کے لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر آئے تھے۔

یوں تو ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ ساری کتاب ہی" قومیت پرستی" کی عظمت سے مرعوب ہو کر لکھی گئی ہے۔ اور جہاں جہاں اسلام کے متعلق کچھ ذکر آیا ہے وہ مصنفہ کی معلومات کی بری طرح سے غمازی کرتا ہے لیکن کتاب کے سرنامہ سے تو یہ چیز بے ساختہ جھلک پڑتی ہے کہ سیاستِ اسلامی اور روح اسلام کے متعلق مصنفہ کی قلبی کیفیت کیا ہے ۔ لوحِ کتاب پر لکھا ہے ۔

بیادگار ڈاکٹر انصاری مرحوم

" میں مواخاتِ انسانی کو ہی واحد وجۂ جامعیت سمجھتا ہوں ۔ نسل یا مذہب کی بنا پر تقسیم و تفریق میرے نزدیک مصنوعی اور مستبدانہ[ف۱] ہے " انصاری

ڈاکٹر صاحب مرحوم تو اب اُس دنیا میں ہیں جہاں ہر حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائیگی لیکن ہم ترکی کی اس نامور خاتون سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک اسلام کی قائم کردہ تقسیم و تفریق واقعی غیر فطری اور مستبدانہ ہے اور کیا اس کے متعین فرمودہ معیار کے اندر صحیح "مواخاتِ انسانی" کا معیار از خود نہیں آجاتا؟

معلوم نہیں جب یہ لوگ " مذہب " کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں تو ان کے ذہن میں کس چیز کا تصور ہوتا ہے۔ کسی چیز کا ہو ۔ کم از کم اسلام کا تو قطعاً نہیں ہوتا ! اللہ ہماری حالت پر رحم کرے ۔ اور ہمیں فراستِ قرآنی عطا فرمائے ۔ کہ صحیح سرچشمۂ علم وہی ہے ۔ باقی سب ظن و تخمین ہے ۔

نوٹ

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز کے مضمون " خدا کی بادشاہت " کو علیحدہ بھی شائع کرایا ہے ۔ دفتر سے طلب فرمادیں۔

قیمت ۱ر صرفہ ڈاک ۰ر (مینیجر)

ف۱ Artificial and Arbitrary.

اسلام اور مذہبی رواداری

بہ سلسلہ "خدا کی پادشاہت"

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے

غالباً آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجۂ استبداد سے کم ازکم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے، ایک آتے ہی کہتا اوہو! قبلہ خیریت ہے۔ آج نصیب اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ رفت گذشت۔ دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرہ پر متردّدانہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولانا خیریت ہے! آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں، چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی کچھ اعضا شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آکر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب، مزاج گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا، فرماتے کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

مولوی صاحب کے بخار آجانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت، لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع قلبِ ماہیت پیدا کر دیتا ہے، اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے منوالیتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرالیتا ہے۔ یہی وہ سحرِ سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں۔ کان اپنے ہیں، لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں،

لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ بالکل ہز ماسٹرز وائس ہوتے ہیں

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اس نے ابھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے اربابِ حل وعقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور اُنہوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں کہیں ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے۔ اربابِ سیاست کے پیشِ نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں، خداوندانِ مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اُٹھے اور زبان و قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ جب دَوَلِ یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو اُنہوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادا میں اک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے۔ لہٰذا اقوامِ یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو جو ایڈیشن شائع کئے۔ دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کرا کے رکھے گئے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج دُنیائے تہذیب و تمدّن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے قتل و غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خوں ریزی، جور و تظلّم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں نظر آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی و خوں خوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ حوادث کی طرح کف بردھاں بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جن کے جلو میں سبعیت و بربریت کے مجسّمے ہولناک آہن پوش جنّات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں اُمنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا، اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے تہذیب و تمدن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذہب و مسلک ایک ایک کر کے جڑ سے اُکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے، کہ گویا (نعوذ باللہ) اس خوں خوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گذرتی ہے آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں۔ بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب و تمدّن کے آئینہ دار قصرِ شاہی

کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں، نہ برہمن کو کہیں امن ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے ایمن۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں، نہ بچے مصئون۔ کچھ قتل کر دئے گئے، جو باقی بچ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں انسانیت عظمیٰ دو دوٹکوں میں فروخت کیجائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھ کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے۔ حقارت و تنفر انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ اور اسے اس "عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدن" کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔ آیئے آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کا یہ ایڈیشن آپ کے سامنے ہے اُس کے صحیح خطوط کیا ہیں۔ اور جس تہذیب و تمدن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جا رہا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت قابلِ داد ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ایسے مذہب کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ آج دنیا کے ہر کتب فروش کی دوکان سے ملسکتا ہے اور جس کے صحیح علم برداروں کا ایک ایک نقش قدم مستند تواریخ کے اوراق پر جلی اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی اس بادشاہت میں جس کا ذکر گزشتہ مضمون میں کیا جا چکا ہے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس کے متعلق اجمالی سی باتیں تو اُس مضمون میں پیش کی گئی تھیں (اور اس اجمال کی تفصیل میں اس عنوان پر قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے ایک مبسوط مضمون جُداگانہ لکھا جا سکتا ہے) لیکن ہم اس وقت تعلیمی اسناد کے بجائے تاریخی اشہاد سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت الٰہی میں پوری طاقت اور قوت کے ہوتے ہوئے محکوم و مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اور اُنہیں بالخصوص مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی۔ اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلم مصنفوں اور مورخوں کے حوالوں سے پیش کرینگے تاکہ کسی قسم کے تعصب، جنبہ داری اور رجحان قلبی کا شائبہ نہ رہے یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم "خدا کی بادشاہت" کے مقدس

نام سے منسوب کرتے ہیں۔ قرن اولیٰ کے ایک مختصر سے عرصہ پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد جو حکومت قایم ہوئی اُسے آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے بایں ہمہ اُس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے قرآنی تعلیم اور اسلامی روایات کے نقوش موجود تھے۔ اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اُس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط وضبط تو عہدِ رسالت مآب صلعم سے ہی شروع ہو گیا تھا اور فتح خیبر یہود مدینہ اور فتح مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن بہ حیثیت حکومت عہدِ فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے۔ اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ہم شروع میں اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسلامی عہدِ حکومت میں غیر مسلم رعایا کو ذمی کہا جاتا تھا جب یروشلم فتح ہوا ہے تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہدنامہ ہوا۔ اس کے اقتباسات سے اندازہ فرمایئے کہ بحیثیت فاتح مغلوب و مفتوح قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔

"یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال اولاد اور عبادت گاہوں صلیبوں اور ہر اُس چیز کی جو اُنکی ملکیت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اُن کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا۔ ان کے کلیساؤں کو نہ تو منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا اور نقصان پہنچایا جائے گا۔ اُنکے اوقاف اور ان کے وقار کو بحال رکھا جائے گا۔ اہلِ یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہو گی اور ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہ رکھا جائے گا۔" [1]

فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ جب گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو وہیں نماز کا وقت آگیا بطریق نے کہا کہ آپ وہیں نماز ادا کر لیں لیکن آپ نے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ مبادا بعد میں آنے والے مسلمان

(1) The Eclips of christianity in Asia—
by Laurance. E. Brown-P. 39.

سنتِ عمرؓ کی تقلید میں اس گرجہ کو مسجد میں تبدیل کریں۔ تالیفِ قلوب۔ بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سر ولیم میوؔ جیسا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب (The caliphate—It's rise and fall. میں اس کا ذکر کیا ہے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جملہ اقوام عالم میں مذہبی تعصب جنون کی حالت تک پہنچ چکا تھا۔ اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہرقل نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے ان کی کبھی دادرسی نہ ہو سکتی تھی۔ غیر مذاہب والوں سے ہی نہیں بلکہ خود عیسائی جو اس خاص فرقہ[1] سے متعلق نہ تھے جس کا ہرقل پیرو تھا ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے۔ چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ:۔

"ہرقل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب و مسلک سے متعلق نہ ہو اس کا ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا۔ لہٰذا ان کی کہیں شنوائی نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ خدائے جبار نے بنی اسماعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کر دیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔ چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنیکے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا اس لئے یہ تو نہ ہو سکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر Chalcedonian قبضہ کر چکے تھے واپس مل جاتے، لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی"۔ [2]

یہی حالت مصر میں تھی۔ ایک آرمینین عیسائی۔ ابو صالح۔ جو تیرھویں صدی کی شروع

---

(۱) Chalcedonian.

(۲) Chronique de Michel le Syrian—II—412, 413.

میں ہوا ہے لکھتا ہے :-

"یہ ایسا وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بیحد ظلم وستم کرتا تھا اور انہیں زبردستی اپنے فرقہ میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہرقل اور مقوقس کے ہاتھوں حقیقت پسند عیسائیوں نے بیحد تکالیف اُٹھائیں۔ جب مظالم انتہا کو پہونچ گئے تو ملت حنفیہ کی ایک قوم اُٹھی جس نے رومیوں کے نخوت وتکبر کو توڑا اور مصر کو فتح کرکے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی۔" [1]

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمر بن عاصؓ نے تمام اہل مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ کر دیا جس کی رُو سے اُن کے املاک نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں۔ ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی اُنکے گرجے اور معبد بالکل مصئون تھے اور دشمنوں کے حملوں سے انکی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔ [2]

فتح دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاست داں سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک طرف حضرت خالدؓ تھے۔ دوسری طرف ابو عبیدہؓ۔ حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کرکے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے نیچے اُتر کر دروازہ کھول دیا۔ اور مسلم فوج درّانہ شہر میں گھس آئی۔ عیسائیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جاکر چپکے سے حضرت ابو عبیدہ سے صلح کرلی۔ چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیت فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف سے ابو عبیدہؓ بحیثیت حلیف بڑھتے آئے وسط شہر میں دونوں فریق آملے۔ نصف شہر بہرحال لڑائی میں فتح ہوا تھا اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہیئے تھا جو بحیثیت فاتح اہل دمشق سے بعد میں طے ہوئیں۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ اُنہوں نے اہل شہر سے صلح کرلی ہے اور وہ اُنہیں امان دے چکے ہیں اسلئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایفائے عہد کے متعلق یونان کے مقنن اعظم سولن نے لکھا ہے "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے

---

(۱) The churches and Monastries of Egypt P. 30, 31

(۲) Preaching of Islam—Arnold.

جو اپنے سے کمزور کو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔"

جب مسلمانوں کی افواج وادیٔ جردان میں پہنچیں تو وہاں کے عیسائیوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ :-

"اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔ اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ اُنہوں نے تو ہمارے گھر بار ہم سے چھین لئے۔" [1]

حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی۔ عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہدیا کہ جاؤ تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہل شہر روتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا کہ کہیں رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو نہ آجائیں۔[2] اللہ اللہ!

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اِسی حمص کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا۔ لیکن چھ مہینہ بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ نصف خراج اہل شہر کو واپس کر دو کہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو اس حفاظت کے بدلے میں خراج کیسا؟[3] کیا ایسی مثال کسی اور تاریخ میں آپ کو مل سکتی ہے؟

جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طواف کعبہ کے دوران میں اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آگئی تو اس نے اعرابی کے منہ پر طمانچہ مارا۔ اعرابی نے فوراً اس کا جواب ویسے ہی طمانچہ میں دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک تو ایک شہزادہ

(1-2-3) Preaching of Islam — Arnold.

اور ایک ادنے دہقانی کا ایک درجہ ہے تو اُس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ ہاں ہمارے نزدیک تو تمہارے لیئے تینوں راستے کھلے ہیں۔ یا مسلمان رہو یا عیسائی ہو کر جزیہ ادا کرو یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔[1]

سب سے بڑا الزام جزیہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے یہ "جرمانہ" ان کے مسلمان نہ ہونے کے جرم کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جدا گانہ ہے مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی اُنکے ذمہ تھی غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اگر ان سے اس حفاظت کے اخراجات کی مد میں کچھ وصول کر لیا جائے جو مسلمانوں کی زکوٰۃ سے بھی کم تھا تو اسمیں اندھیر کیا ہے؟ عورتیں بچے بوڑھے اپاہج اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے۔[2]

اور پھر اس جزیہ کی مقدار کتنی تھی؟ معمولی حیثیت والے سے ۳ سالانہ، متوسط درجہ والے سے ۶ اور اس سے آگے خواہ کوئی کروڑپتی ہو زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ۔ حالانکہ ایک کروڑپتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔ صدقات وخیرات اس کے علاوہ ہوں گے اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت لاحق ہو گی تو یہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں بھی شریک ہو گا اور ذمی رعایا کے مال۔ جان۔ مذہب۔ معابد کی حفاظت کرے گا۔ یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا رہیگا اور اُسی حیثیت کا ایک مسلمان اڑھائی لاکھ روپیہ ادا کرنے کے بعد اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدانِ کارزار میں دشمن کی شمشیر و سنان کا مقابلہ بھی کریگا دشمن کی گولیاں ہوں گی اور مسلمانوں کا سینہ جو غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے سپر کا کام دیگا مسلمانوں سے پیشتر ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھا تھا وہ ساسانی رعایا سے دُگنا ہوتا تھا اور اس کے

(۱) Eclips of Christianity.

(۲) Khalifs and their Nonmuslim subjects—Tritton.

جواز میں شاہ سابور دوم نے کہا تھا کہ لڑائی ہمیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں دُگنا کیوں نہ ادا کریں[1]؟ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے عیسائی قبیلہ نے اس رعایت سے فائدہ اُٹھایا[2]۔ اہل حیرہ نے جزیہ دیا تو ان سے یہ شرط تھی کہ ان پر خواہ مسلمان حملہ آور ہوں خواہ غیر مسلم ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی[3] اور ہم حمص کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں۔ کہ جب مسلمان حفاظت کی ذمہ داری سے سُبکدوش ہوئے تو باقی ماندہ زرِ جزیہ ذمیوں کو واپس کر دیا۔ کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے گا کہ جزیہ غیر مسلموں سے اسلام قبول نہ کرنے کے جُرم کی پاداش میں وصول کیا جاتا ہے؟

ذمّیوں کے حقوق کا مسلمانوں کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ یہ تھے

> "میں ذمّیوں کے حقوق اب اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں ان کو خدا اور رسولؐ نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس لئے میرے جانشین کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جو معاہدے ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان پر شدّت سے پابندی ہو اور ان پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہ ڈالا جائے[4]۔"

حضرت عمرؓ کے خلاف بعض الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ اُنہوں نے مذہب کے معاملہ میں عیسائیوں پر کچھ پابندیاں عاید کر رکھی تھیں لیکن سر تھامس آرنلڈ نے (Caetin.) وغیرہ کے حوالہ سے اسکی تحقیق کی ہے کہ یہ تمام الزامات بعد کی اختراع ہیں اور ابن حزم سے پہلے ان کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ واقعات بھی حضرت عمرؓ کے عہد کے ہیں کہ اُنہوں نے ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمّی کو قتل کر دیتا

---

(۱) Introduction to the History of the Assyrian Church— Wigram

(۲) و (۳) Arnold's.

[4] طبقات ابن سعد جس کی تائید آرنلڈ نے بھی کی ہے۔

توحضرت عمرؓ اس مسلمان کو ذمّی کے قتل کے بدلے میں قتل کرا دیتے اُنہوں نے تمام زمینیں ذمیّوں کے قبضہ میں رہنے دیں اور یہ حکم دے دیا کہ کوئی مسلمان کسی ذمّی کی زمین خرید نہیں سکتا ذمیّوں کے علاقہ کے متعلق کوئی معاملہ پیش آتا تو انہی کے نمایندوں سے اس کے بارہ میں مشاورت ہوتی۔ قاعدہ تھا کہ جو شخص آپاہج اور ضعیف ہو جاتا اور محنت و مزدوری سے کسب معاش نہ کر سکتا تو اس کے لئے بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر ہو جاتا، مساوات کی یہ انتہا ہے کہ اس رعایت میں مسلمانوں کے ساتھ ذمّی بھی برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ ابن ولید نے حیرہ کے ذمیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس میں یہ شرط بھی داخل تھی۔ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ حکومت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی، لیکن روح اسلامی ابھی مسلمانوں میں موجود تھی چنانچہ عہد بنی اُمیّہ اور عہد عباسیہ میں بھی ہمیں مذہبی رواداری کے درخشندہ واقعات صاف صاف نظر آتے ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز رضؒ نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گرجا کوئی صومعہ گرایا نہ جائے[1]

خلیفہ ہشام کے لڑکے نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ ایک مسلمان کو ایک عیسائی نے مارا ہے خلیفہ نے کہا کہ اس سے کہو کہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرے مسلمان اور عیسائی کی تمیز کیسی[2]

خلیفہ المامون کے وقت میں ایک پادری یزدان بخت دربار میں آیا، مسلمانوں سے اس نے مباحثہ کیا اور ہار گیا۔ خلیفہ نے کہا اب مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے۔ خلیفہ نے کہا اپنی مرضی سے اس میں زبردستی کوئی نہیں۔ اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے مبادا کوئی نادان اسے نقصان پہونچا دے[3] عہد عباسیہ میں نسطورین فرقہ کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کا تنازع ہو گیا۔ ایک مسلمان مارا گیا جس سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے ان کے گرجے پر حملہ کر دیا۔ گرجے کو اتفاقیہ آگ لگ گئی۔ عیسائیوں نے مسلمان قاضی کی عدالت میں دعوے دائر کر دیا چنانچہ ابو حامد اسفرائینی اور ابو بکر خوارزمی جیسے جلیل القدر مقنّنین کی رائے سے

(۱-۳) The caliphate.....Muir.

(۲) Preaching of Islam—Arnold.

یہ فیصلہ ہوا کہ جس شخص نے گرجے پر حملہ کرنے میں سابقت کی ہو وہ مجرم ہے اُسے اس کے جُرم کی سزا دی جائے[1] ان واقعات سے اس زمانہ کی عام مذہبی آزادی کا پتہ چل سکتا ہے۔

مصر میں سلطان صلاح الدین کے وقت میں عیسائی اچھے اچھے عہدوں پر متمکن تھے۔ سکرٹیری۔ اکونٹنٹ۔ رجسٹرار بالعموم عیسائی ہوتے تھے[2] مسٹر لارنس ای براؤن نے لکھا ہے کہ مصر میں عیسائیوں پر سوائے خلیفہ الحاکم کے عہد کے جو درحقیقت دیوانہ قرار دیا جاتا تھا کبھی ظلم وستم نہ ہوا اور جہاں کہیں عیسائیوں نے کچھ مصیبتیں اُٹھائیں وہ ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تھیں[3] جنگ صلیبی کے وقت بہت سے عیسائی مسلمانوں کے کیمپ میں پناہ گزیں ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کو امان دی۔ ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور بہت سے وہیں ملازم ہو گئے اور اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم رہے اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا۔ انہی حالات کی روشنی میں سر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ :-

"اگر خلفائے عباسیہ چاہتے تو جس طرح ازبلا اور فرڈی ننڈ نے ہسپانیہ سے اسلام کو خارج کر دیا تھا یا لوئس چہاردہم نے فرانس میں پراٹسٹنٹ کے عیسائی فرقہ کو مجرم قرار دے دیا تھا وہ بھی اشیائے کوچک سے عیسائیت خارج کر دیتے لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔"[4]

انہی صلیبی لڑائیوں کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک سرہنگ، فرنگی فوج سے ایک شیر خوار بچہ اُٹھا لایا اس کی ماں رنج وغم سے بے قرار ہو گئی اور اپنے سرداروں کے پاس جا کر روئی اُنہوں نے کہا کہ سلطان صلاح الدین ایک سچا مسلمان ہے اس کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ وہ روتی ہوئی آئی اور اپنی داستان سنائی۔ سلطان یہ کہانی سنتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو سلطان غصہ سے کانپ رہا تھا خود اُٹھا ساری فوج میں تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ بچہ بیچ دیا گیا ہے۔ اُس کے دام ادا کر کے بچہ کو واپس منگایا اور اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور سوار کرا کے عزت کے

(۲،۴) Preaching of Islam- Arnold.

(۱،۳) Eclipse of Christianity

ساتھ واپس پہنچا دیا۔

جس زمانہ میں سلطان رملہ کے متصل خیمہ زن تھا یا فا میں انگلستانی بادشاہ رچرڈ بیمار پڑا رچرڈ کے پاس اس وقت صرف دو تین سو سپاہی تھے سلطان نے حکم دیا کہ بیمار دشمن پر حملہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ رچرڈ کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا سلطان اسے روزانہ برف اور میوہ بھیجتا تھا اور بعض مورخ تو لکھتے ہیں کہ سلطان خود طبیب بن کر اسے دیکھنے گیا اور اس کا علاج بھی کیا۔

جب فرنگی بیت المقدس میں سلطان کے محاصرہ سے تنگ آ گئے تو امان کے طالب ہوئے اس نے امان دے دی اور کہا کہ تمام فرنگی چالیس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں۔ جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سپاہیوں نے دیکھا کہ فرنگی اشرفیوں کے صندوق بھر بھر کے لئے جا رہے ہیں سلطان سے جا کر کہا کہ فاتح فوج ایسی غنیمت سے کیوں محروم کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ درست ہے لیکن بدعہدی ہمارا شیوہ نہیں۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیاد کی قیادت میں جو کتیھولک تھا میدان قوصوہ میں صف آرا تھا اس وقت ہونیاد کے ساتھی سلطان سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہو گئی تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ سب کو کتیھولک بنا کر چھوڑوں گا۔

لیکن جب یہی سوال سربیائے مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک کنیسہ بنانے کی اجازت دے دوں گا تاکہ جس کا جی چاہے مسجد میں آئے جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ سربیا نے ہونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے صلیبیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

ایک بار ایک عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہد اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت

کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر۔ یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا اس زمانے کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خفیہ خطوط لکھتے رہتے تھے اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دست یاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا فی الواقع مسلمانوں کے عہدِ حکومت سے مطمئن اور خوش تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر کیوں نہ لکھتے ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق الیشوب سویم دیوار وشیر (فارس) کے ساہین کے نام ایک خط کے دوران میں لکھتا ہے[1]

"یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں لیکن اُنہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خدائے مسیحی کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں، اور کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف و اکرام کا سلوک کیا جاتا ہے[2]"

چوں کہ اس بطریق کا زمانہ قریباً ۶۴۷ء لغایتہ ۶۶۰ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا ہوگا۔ یروشلم کے فرقہ ملکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں رقم طراز ہے:۔

"مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا رکھتے ہیں[1]"

اسی طرح نزبن کے میٹروپولیٹن الیاس نے ۱۰۰۸-۹ء میں لکھا ہے:۔

"مسلمانوں کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی اطاعت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں اور

---

(۱) Eclips of christianity. Assemani, III, Pt. II.

(۲) Boehier-P. 31.

خواہ وہ ہم سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی غیر مذہب والے کو ستائے گا نبی اکرم صلعم قیامت کے دن اس مسلمان سے مواخذہ کریں گے[1] ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب کبھی ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے۔ برعکس اسکے دوسرے مذاہب کے متبعین میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا لہذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ اُنہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا انکی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہلِ مذاہب کے حسنِ سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی بنا پر ان کے قانون نے اُنہیں بتایا کہ اُنہوں نے یہ بُرا کام کیا ہے[2]"

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا مسلمانوں کے عہد حکومت اور ان کے اصولوں کو کس قدر نعمت الٰہی سمجھتی تھی اور ان کو کس قدر اطمینان اور آزادی حاصل تھی۔ برعکس اس کے اس زمانے میں جہاں کہیں مسلمان عیسائی حکومت میں آباد تھے ان پر انتہائی مظالم توڑے جاتے تھے۔ ابی سینیا میں شاہ سیفا آراد نے حکم عام دے رکھا تھا کہ تمام ملک میں جتنے مسلمان ہیں یا تو عیسائی ہو جائیں یا ملک بدر کر دئے جائیں یا جہاں ہوں وہیں قتل کر دئے جائیں[3]

حالانکہ یہ وہ ابی سینیا ہے جو مسلمانوں کی وسعت ظرف کے صدقے میں عیسائیوں کے قبضے میں رہا تھا نجاشی نے مسلمانوں کے سب سے پہلے مہاجرین کے قافلے کو سات آٹھ سال تک اپنے ہاں پناہ دی تو مسلمانوں نے اس احسان کا بدلہ اس انداز سے دیا کہ سات آٹھ سو سال تک جب کہ چین سے لے کر مراکش

---

[1] یہ ابوداؤد کی ایک حدیث کی بنا پر ہے (پرویز)

(۲) The Eclips.....

(۳) Preaching of Islam.

تک اسلامی پرچم لہراتا رہا حبش کی عیسائی سلطنت میں جو ایک مختصر سے قطعہ ارض پر مشتمل تھی۔ کبھی دخل اندازی نہ ہوئے درآں حالیکہ نجاشی اول کا جانشین ہی مسلمانوں کے مخالف ہو گیا تھا اور ۹ھ میں ایک دستہ فوج لے کر جدّہ تک چڑھ آیا تھا نبی اکرمؐ نے بجائے جنگ کرنے کے اس سے صلح کا برتاؤ کیا اور نجاشی کے احسان کے بدلے میں مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ

سالموا الحبشة ما سالمتكم — جب تک اہلِ حبش تم سے مصالحت رکھیں تم بھی ان سے مصالحت رکھنا۔

یہ تو تھا مسلمانوں کا طرزِ عمل حبش کے عیسائیوں کے ساتھ لیکن ہی حبش کا خود اٹلی کے عیسائیوں کے ہاتھوں کیا انجام ہوا دُنیا اس پر شاہد ہے۔

اسپین میں جب مسلمان داخل ہوئے تو وہاں کی عیسائی سلطنت کے ماتحت یہودیوں پر ایک قیامت برپا تھی۔ اُنہوں نے یہودیوں کو اُن کے پنجۂ استبداد سے چھڑایا اور خود عیسائیوں کو ان کے مذہب میں کامل آزادی عطا کی وہ اپنے معاملات کا تصفیہ اپنے قاضیوں سے کراتے۔ ہر قسم کے مذہبی تیوہار مناتے، نئے گرجے بھی تعمیر کرتے۔ آخری زمانہ میں عیسائی مذہبی جوش میں قرطبہ کے بازاروں میں آکر رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی برتتے لیکن اسلامی حکومت کی طرف سے سزا صرف انفرادی مجرم کو دی جاتی۔ اس کے ہم مذہب دیگر افراد سے کوئی باز پرس نہ ہوتی اور تمام عیسائی رعایا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتی[1] فتح قسطنطنیہ کے وقت ایک روسی مورخ کا بیان ہے کہ "عیسائیوں کے مظالم سے غریبوں پر خدا کی دنیا تنگ آچکی تھی۔ مسلمان اس کے خرمن استبداد پر برقِ خاطف بن کر گرے۔ ان کی منصف اپنی امانتوں میں کبھی خیانت نہیں کرتے تھے"[2]

فارس میں آتش پرستوں کے معبد بالکل محفوظ رہے۔ دسویں صدی یعنے فتح ایران کے تین سو سال بعد تک کے مورخین کے بیان کے مطابق عراق، فارس، کرمان، خراسان، آذربائیجان میں آتشکدے موجود تھے۔ المعتصم کے عہد میں ایک جرنیل نے ایک امام مسجد اور مؤذن کو دروں سے پٹیا کہ ان کے

---

(۱) Arnold's

(۲) Karamsin-Vol. V. P. 43.

متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پُرانے آتشکدے کو مسجد میں تبدیل کرانا چاہتے تھے - شیراز میں گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کیئے جاتے اور یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے[1]

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا حیرت انگیز اثر ہے کہ وہ گویا انسان کی فطرت ہی بدل دیتی ہے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت کے مجسمے تصور کیئے جاتے ہیں ہر زبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے اس سے ان کے مذہبی تعصب و جنون کا اندازہ لگا لیجیئے - چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے عہد حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خاں نے پیٹرک اسقف کے نام ۱۳۱۲ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدود سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجہ کو نقصان نہ پہنچائے گا - اس کی جائداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً تعرض نہیں کرے گا جو ایسا کرے گا وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہوگا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ - [2]"

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل ہے یہاں مسلمانوں کے عہد حکومت میں مذہبی رواداری کا زندہ ثبوت خود یہاں کی مردم شماری ہے - ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا لیکن بایں ہمہ سلطنت مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی[3] اور جب تلوار ہاتھ سے نکل گئی تو اس اسّی سال کے عرصہ میں وہ تین گنا

---

(۱) **The Caliphs and their Non-muslim subjects-P. 107.**

(۲) **Arnold's**

[3] ڈاکٹر ہنٹر کی ایک بیان کی رو سے جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں گئی تو مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۸۸۱ء کی رو سے مسلمان کل آبادی کا پانچواں حصہ - یعنے ۵ کروڑ - لیکن ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۹ کروڑ (پیدویز) -

ہوگئی۔ ان اعداد و شمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کرلی تو شمشیر بچاری کے حصہ میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے۔

سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمد بن قاسم کے زیر قیادت مسلمان سندھ میں آئے سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح رہنے دئے ان کو بت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود نصاریٰ پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا"[1] محمود غزنوی کے حملے مسلم جور و استبداد کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ:۔

"محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہل مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی"

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب "واقعات ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے"

ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی تدبیر مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جنکی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ انکے مذہبی رسوم کو بجا لانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں"

اکبر کے عہد میں یہ رواداری تو گویا جانب داری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ مان سنگھ کو مثلاً وہ اقتدار حاصل تھا جو شاید پرتھوی راج کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ راجہ ٹوڈرمل وغیرہ کی قدر و منزلت کسی

---

(1) The Caliphate..... P. 363.

صورت میں بکرماجیت کے نورتنوں سے کم نہ تھی۔ مذہبی آزادی کے متعلق رائے بہادر لالہ بیج ناتھ اپنی کتاب "ہندوستان گذشتہ وحال" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمان فرماں رواؤں کی نسبت یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں نئے مندر بننے کی اجازت نہ تھی لیکن یہ سراسر غلط ہے دہلی، آگرہ، متھرا وغیرہ میں جو اسلامی قوت وسطوت کے خاص مرکز تھے۔ بہت سے مندر شاہان اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اس وقت تک موجود ہیں۔"

اورنگ زیب کے تو نام سے ہی ایک خونچکان منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کم از کم اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب تک سوا من زنار نہیں اُتروالیتا تھا کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔"

لیکن تاریخ کے ان صفحات کو کہاں لے جائیے جن پر ثبت ہے کہ

"اورنگ زیب کو خبر پہونچی کہ بنارس کے بعض حکام برہمنوں کو ستاتے ہیں تو اس نے ابوالحسن گورنر بنارس کو فرمان بھیجا کہ ہماری شریعت کا حکم ہے کہ مندر نہ ڈھائے جائیں اور ان کے پجاریوں پر سختی نہ کی جائے لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے[2]"

اسی طرح بابو رام نرائن صاحب منیجر ریاست رام نگر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

"ضلع سیتاپور میں مصر کے مندر کو عالمگیر نے چند مواضعات جاگیر میں دئے جواب تک موجود ہیں۔ نیز متھرا کے نزدیک بلدیو راؤ کے مندر کو بہت سے گاؤں جاگیر میں دیئے"

بابو منوہر لال صاحب اوہری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:۔

---

[1] اگر ایک زنار کے تاگہ کا وزن ایک تولہ بھی فرض کر لیا جائے تو گویا ... ہم ہندو ہر روز مسلمان کئے جاتے تھے یا قتل کر دئے جاتے تھے۔ اب اندازہ فرمائیے کہ اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں کس قدر ہندو مسلمان ہوئے یا قتل کئے گئے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

کا اعجاز معشوقانہ آتا ہوگا۔ یا للعجب۔ منہ

[2] "بنارس سٹی" مصنفہ نرنجن سین صاحب۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل۔

"اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں دیں اس کے بڑے بڑے عہدہ دار ہندو تھے"

پروفیسر الیشوری پرشاد صاحب اپنی "تاریخ ہند" میں لکھتے ہیں۔

"ملتان میں تو تلہ مائی کے مندر کو ایک سو روپیہ سالانہ جاگیر عالمگیر نے عطا فرمائی ڈیرہ دون کے گوردوارہ کو جاگیر دی۔ ہندوؤں پر سے محصول جاترہ جو پہلے سے چلا آتا تھا موقوف کر دیا۔"

سکھ حضرات کے ہاں تو "اورنگا" کے مظالم کی داستانیں ہر تقریب پر دہرائی جاتی ہیں اور ان میں گورو گوبند سنگھ جی کے واقعات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے لیکن رائے بہادر کنہیا لال اپنی "تاریخ پنجاب" میں لکھتے ہیں:۔

"گورو گوبند سنگھ جی نے محاصرہ کے بعد اورنگ زیب کو فارسی میں عرضی لکھی کہ میں سیاست سے الگ ہو کر عبادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں بادشاہ نے لکھا کہ اگر ایسا ہے تو آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے تمام حکام کو اس کے مطابق احکام جاری کر دئے۔"

متاخرین میں سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو بھی اس بارے میں بہت بدنام کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو مسلمان کر لیا ان کے متعلق سر تھامس آرنلڈ لکھتے ہیں۔ کہ:۔

"یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ان خاندانوں کا مسلمان ہونا ان بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔"

اسی حیدر علی کے دو وزیر برہمن تھے اور شاما برہمن اس کا معتمد خاص تھا[1]

ملوکوٹہ میں جو وشنو کا مندر ہے اس میں دو چاندی کے برتن ہیں جن پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"یہ برتن ٹیپو سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ مندر کو دئے گئے۔"

---

[1] سوانح عمری حیدر علی۔ از ڈپٹی لال نگم۔

ان واقعات کے دُہرانے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان مسلمان فرماں رواؤں کی وسعت نظر اور کشادہ دلی کے قصائد لکھے جائیں بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ان کے عہدِ حکومت میں اسلامی کلچر اسلامی روایات اور اسلامی تعلیم کے کچھ نہ کچھ آثار باقی تھے۔ اس لیئے ان کا تقاضا تھا کہ غیر مذاہب والوں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے تاریخ کے یہ صفحات آپکے سامنے ہیں غیر مسلم مصنفین کی شہادتیں موجود ہیں انکی روشنی میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت پر نگاہ ڈالیئے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، چین میں ہوں یا ترکستان میں، مصر میں ہوں یا ہندوستان میں۔ چونکہ قرآن کریم کی تعلیم کا تقاضا تھا کہ کسی شخص پر محض اختلاف مذہب کی بنا پر کوئی زیادتی نہ کی جائے اس لیئے کسی کا ذاتی رجحان اور طبعی میلان کچھ ہی کیوں نہ ہو جب وہ قرآن کریم کو سامنے رکھ لیتا تھا تو عدل و انصاف سے اعراض نہیں کر سکتا تھا۔ جب عام مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کی مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ جب دنیا میں صحیح معنوں میں خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے تو اس وقت تمام نوعِ انسانی کو کس قدر آزادیٔ مذہب اور حرّیت فکر حاصل ہو گی غیر مذاہب کے حضرات اگر ان واقعات پر غور و فکر کی نگاہ ڈالیں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کا دامن ان تمام خونی دھبّوں سے پاک ہے جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتۂ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اسکے خدا کا اعلان ہے کہ

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔ (۵:۸) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ برتو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:۔

"تاریخ (کے واقعات) جو ہم نے اس کتاب کے صفحات پر بے نقاب کئے ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام ایشیا کے عیسائیوں سے بزورِ شمشیر" نہیں منوایا گیا۔ بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی ہے[1]"

برعکس اس کے

"صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیح کے لئے بزور شمشیر ایک سلطنت حاصل کر لیں[2]"

(۱،۲) The Eclips of christianity in Asia, PP. 183-184 & 143.

متبادل دستورِ ہند

Alternative Constitution for India.

ذیل میں ہم محترم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کے مرتّب فرمودہ متبادل دستورِ ہند (Alternative Constitution.) کے پورے مسودے کا خاص ترجمہ[1] شائع کرتے ہیں۔ اس مسودہ کا اصل متن سب سے پہلے اسٹیسمین بابت ۳/۳۹ ۳۱ میں شائع ہوا تھا۔ قارئین سے مخفی نہ ہوگا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رُو سے ہندوستان کے لئے ایک ایسا وفاقی نظام (فیڈریشن اسکیم) زیر غور ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت" موجود ہے۔ چونکہ یہ مفروضہ حقیقت نفس الامری کے خلاف ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا نظام جس کی رُو سے مسلمانوں کا مِلّی وجود مفقود ہوجائے کسی صاحبِ احساس و بصیرت مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس نظام کی واضح الفاظ میں مخالفت کی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے لئے ایسا نظام قابلِ قبول نہیں ہے تو وہ کس قسم کا نظام چاہتے ہیں۔ یہ مسئلہ لیگ کے زیر غور تھا کہ ہمارے محترم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اس مشکل مسئلہ کا نہایت عمدہ حل پیش کردیا۔ اور اُنہوں نے ایک ایسے وفاق کا خاکہ تیار فرمایا جو تہذیبی متجانس مملکتوں (Culturally Homogeneous States.) پر مشتمل ہو۔ چونکہ یہ خاکہ ایک مسلمان کا تیار کردہ ہے جو اپنے خدا کی طرف سے ہمیشہ عدل و انصاف پر مامور ہے اس لئے اس دستور میں ہندوستان کی کسی قوم پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی گئی ہے بلکہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر قوم کو اپنی اپنی تہذیب اور کلچر کے ماحول میں پورے نشو و ارتقا کے مواقع بہم پہونچائے جائیں جیسا

---

[1] مولوی خواجہ محمد معین الدین صاحب حیدرآبادی (بی۔ اے عثمانیہ) نے ہماری درخواست پر ترجمہ فرمایا ہے۔

کہ ہم سابقہ اشاعتوں میں بیان کر چکے ہیں۔ شمال مغرب میں ایک اسلامی علاقہ (Block) کے قیام کا خیال حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی فراست و تدبر کا رہین منت ہے۔ آپ پہلے شخص تھے جو ہندوستان میں واحد متجانس قوم کی تخلیق کے عدم امکان کا صحیح صحیح اندازہ لگا چکے تھے۔ اس امر کا اعلان آپ کو ان کے اس خطبۂ صدارت میں ملیگا جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ جس تحریک کے بانی تھے وہ بعد میں "پاکستان" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے موجودہ حالات کی روشنی میں اسی تحریک کو وسعت دی ہے اور شمال مغرب میں مسلم علاقہ کے قیام کی تجویز کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے بقیہ ملک کے مسلم مفاد کو بھی اپنی اسکیم میں شریک کر لیا ہے۔ صاحب موصوف نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر تہذیبی وحدت (Cultural Unit.) خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک ایسا مسکن (Home-Land.) ملنا چاہیئے جہاں وہ دوسری وحدتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھتا ہوا اپنے تہذیبی انداز پر ترقی کر سکے اس نظریہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشہور مقالہ "ہندوستان کے تہذیبی مستقبل" میں کی ہے (جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے)۔ موجودہ اسکیم ایک عملی خاکہ ہے جو اس نظریہ کو قطعی صورت عطا کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔

چونکہ اس اسکیم کی رو سے مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے ماحول میں اپنے جداگانہ تشخص کے قیام و بقا کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہندو۔ اور ہندو نواز حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان کے حصے بخرے کئے جا رہے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل سطحی ہے۔ اسکیم کا مقصد تفریق و تشتت نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد حقیقی بنیادوں پر ہندوستان ایک دوامی اتحاد عطا کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر اسکیم کا حقیقی مقصد جس کو بحث و تمحیص میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ ہے کہ ملک متحد کیا جائے۔ لیکن یہ اتحاد ایسے مفروضات پر مبنی نہ ہو جسے اکثریت نے اپنے

مفاد کی خاطر وضع کر رکھا ہے بلکہ ان حقیقتوں پر مبنی ہو جن سے چشم پوشی کرنا تمام مشکلات کا سرچشمہ ہے۔ ہندو قومیتوں کو ہندوستان کی تہذیبی تقسیم کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خود کانگریس کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اور سچ پوچھا جائے تو کانگریس کے مقابلہ میں یہ اسکیم زیادہ مکمل ہے کیونکہ کانگریس کے ذہن میں تہذیبی تقسیم صرف لسانی بنیاد پر ہے اور اسکیم زیر نظر کا اصول ایسا جامع ہے کہ اس میں لسانی پہلو بھی داخل ہو جاتا ہے۔ پھر کانگریس کی تقسیم مسلمانوں کو تہذیبی خود مختاری (Cutural Autonomy) عطا نہیں کرتی۔ برخلاف اسکے اس اسکیم میں ہر تہذیبی وحدت کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک مسکن تجویز کیا گیا ہے۔ جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق ترقی کر سکے۔ اور دوسری وحدتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھ سکے۔ یہ اسکیم ہندو مسلم مسئلہ کا پُرامن حل ہے اور اس کے ذریعے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا کرنا مقصود ہے جس میں کسی اقلیت کو اکثریت کی چیرہ دستیوں کا خوف نہ ہو۔

اس وقت ملک کو جس چیز پر فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ متبال دستور ہے جو قانون ۱۹۳۵ء کے بجائے پیش کیا گیا ہے۔ نصب العین تو یہ ہے کہ ہندوستان کو باقاعدہ تہذیبی منطقوں (Cultural Zone.) میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری مرحلہ (Transitory Period) ..... بھی ناگزیر ہے۔ یہ عارضی قانون اس مرحلہ کے طے کرنے میں ممد ہوگا نصب العین تک پہونچنے کے لئے ایک مقام پر جبری تبادلۂ آبادی کا سوال بھی آجاتا ہے لیکن دستور زیر نظر کے بموجب سردست یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کانگریس کا یہ دعوے کہ وہ تمام اقوامِ ہند کی مشترکہ نمائندہ اور ان کے مفاد کی محافظ ہے۔ درست ہوتا تو اس قسم کا دستور فوراً کانگریس کی طرف سے پیش ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن کانگریس کی حقیقت اب بے نقاب ہو چکی ہے اس لئے اس کی طرف سے کوئی

ایسی کوشش کیوں ہو جس کی رو سے مسلمان بھی آزادی کی فضا میں سانس لے سکے ہم ہندوستان کے ہر صاحبِ بصیرت سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مجوزہ دستور پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اس دستور کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اوّلاً وفاقی (Federal List) کو اقل ترین درجہ تک گھٹا کر ہر صوبہ داری وحدت کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری عطا کرتا ہے اور یہاں کسی سیاسی جماعت کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ دوم یہ دستور انگریزی انداز کی پارلمنٹری عاملہ (Parliamentary Executive.) کی بجائے جو ہندوستانی حالات کے ماتحت اکثریت کی حکومت کے مرادف ہوتی ہے۔ صوبوں اور مرکز میں ایک ایسا مخلوط اور مستحکم عاملہ (Composite Stable executive.) تجویز کرتا ہے جس کی پالیسی متفق علیہ ہو اور جس کی مثال امریکہ کا عاملہ ہے۔ جو لوگ ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں ہیں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دونوں قوموں کے باہمی اشتراکِ عمل کا یہی ایک دانشمندانہ طریقہ ہو سکتا ہے۔ متبادل دستور کے یہ اہم اجزا ہیں۔ اب ہندو ارباب سیاست کا فرض ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔

ہمارے نزدیک تو اس اسکیم کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے صرف ایک ہی اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس کی رُو سے ہندوؤں کے وہ خواب جن کی رو سے مسلمانوں کی حیثیت اس ملک میں اچھوتوں سے زیادہ نہیں رہنے پائی، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔ یہ اسکیم سردست مسلم لیگ کے زیرِ غور ہے ممکن ہے وہ اس میں جزئی تبدیلیاں کر دے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کے حامیوں کے زاویۂ نگاہ سے زیادہ مطابقت دینے کے لئے اس اسکیم میں کسی اور فرعی ترمیم کی ضرورت لاحق ہو جاتی۔ لیکن جہاں تک اصول کا تعلق ہے، دستور و آئین کے ماتحت اس اسکیم کے مطابق دستوری ہی مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ

فیڈریشن کی کسی متبادل اسکیم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو اس کا اطلاق ان تجاویز پر بھی ہو سکتا ہے جو کانگریس اپنی میثاق (Convention) کے ذریعے پیش کرے گی۔ لیکن اگر کانگریس گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی مذمت ایمانداری کے ساتھ کر رہی ہے تو اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اس متبادل دستور میں مسلم لیگ کے ساتھ اتفاق نہ کرے اور پارلیمنٹ کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے کیوں کہ یہ دستور اتحاد کا دستور ہے۔ افتراق کا نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اسکیم یا اس قسم کی اور کوششیں آئینی جدوجہد ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کس طرح ہو سکتا ہے ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے نزدیک ایک مسلمان کا نصب العین تو حکومت الٰہی کا قیام ہے اور بس۔ لیکن جن حالات میں ہم گھر چکے ہیں۔ ان کے ماتحت اس قسم کی آئینی کوششیں بھی نہایت ضروری ہیں اسلئے جناب ڈاکٹر عبداللطیف صاحب فی الحقیقت تمام قوم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اور اگر برادرانِ وطن تنگ نظری سے کام نہ لیں تو ان کی طرف سے بھی مستحق مبارک باد ہیں۔ چونکہ یہ اسکیم ایک قانونی مسودہ ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ اصطلاحی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لئے سرسری مطالعہ نہیں بلکہ غور و تدبر کی بھی ضرورت ہوگی۔ طلوع اسلام۔

مسودہ اسکیم جس کو ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب حیدرآبادی نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ذیلی کمیٹی کے ایماء پر جو بمقام لاہور بتاریخ ۲۹ جنوری ۱۹۳۹ء عیسوی منعقد ہوئی تھی مرتب کیا ہے

یہ مسودہ حسب ذیل اجزاء پر مشتمل ہے

(۱) قرارداد برائے منظوری آل انڈیا مسلم لیگ جس میں حسب صراحت فہرست منسلکہ ہندوستان کے لئے نئے دستور کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

(۲) فہرست منسلکہ کے تین حصے ہیں

(الف) حصہ اوّل و دوم میں اس نصب العین کی وضاحت کی گئی ہے جو مسلمانان ہند کے پیش نظر رہنا چاہیئے۔

(ب) حصہ سوم میں قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کی مجوزہ فیڈریشن کی اسکیم کی بجائے ایک متبادل اسکیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو نصب العین مندرجہ (الف) کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء — شرح دستخط حاجی سر عبداللہ ہارون

مسودہ قرارداد

برائے منظوری مسلم لیگ

چونکہ قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء میں جو دستور تجویز کیا گیا ہے وہ مسلمانان ہند کے لئے ناقابل قبول ہے کیونکہ:-

(الف) یہ دستور اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہندوستان کی آبادی ایک مخلوط (Composite) قوم پر مشتمل ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے، کیونکہ اس ملک کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان دو مختلف معاشرتی نظامات سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی زندگی کے ہر جزو میں دو اساساً مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

(ب) اس دستور کے تحت جو جمہوری اکثریتی حکومت (Democratic Majority Govt) قائم کی جانے والی ہے اور جس کی مثال اس وقت ایک سے زیادہ صوبجاتی وحدتوں میں موجود ہے وہ فی الحقیقت ایک ہی غالب قوم یعنے ہندوؤں کی حکومت ہوگی جنکے رحم و کرم پر دوسری قوموں کو زندگی بسر کرنا پڑے گی۔

(ج) یہ دستور مسلمانوں کو نہ صرف مرکز بلکہ اکثر برطانوی صوبہ جات اور معدودے چند کے سوا

باقی سینکڑوں دیسی ریاستوں میں دوامی طور پر ایک بے دست و پا اقلیت (Minority) بنا دیتا ہے۔

(ج) یہ دستور مسلمانوں کو اُن کے معاشی احیاء اور اسلامی اصول پر آزادانہ تہذیبی ترقی کے مواقع عطا نہیں کرتا۔

(ح) یہ دستور ملک میں مسلمانوں کی تاریخی اہمیّت کو زائل کر دیتا ہے اور ان کے لئے ایسی حیثیت اختیار کرنے کے امکان کا ہمیشہ کے لئے سدِّ باب کر دیتا ہے جس کے ذریعے وہ ملک کے نظم و نسق پر اپنا مفید اثر ڈال سکیں اور۔

(د) یہ دستور ہندو اور مسلمانوں کے موجودہ تہذیبی اختلافات کو جو مذہبی۔ سماجی۔ معاشی تعلیمی اور سیاسی اُمور میں رُونما ہیں اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی غیر معین طور پر ملتوی ہوتی چلی جا رہی ہے ترقی دینا اور دوام عطا کرتا ہے۔

لہٰذا مسلم لیگ برطانوی پارلیمنٹ سے مطالبہ کرتی ہے کہ قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کو کسی ایسے قانون سے بدل دے جو ملک کو حسب صراحت فہرست (۱) قرارداد ہذا تہذیبی متجانس آزاد مملکتوں کے احدیہ (Confedracy of cutturally homogeneous Free States) میں منسلک کر دے۔

فہرست اوّل

حصّہ اوّل

تمہید

تہذیبی اساس پر متجانس مملکتوں (Culturally Homogeneous States) کے احدیہ (Confederacy) کے قیام کے لئے ملک کی ایسی تہذیبی وحدتوں

(Cultural Units.) یا قوموں کو جو اپنی تعداد یا معاشی حیثیت سے متجانس مملکتیں بن سکتی ہیں مختلف منطقوں (Zones.) میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ چونکہ یہ تقسیم ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنے ہندو اور مسلمان کے مابین ہو سکتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ بتانا چاہیئے کہ ان کے لئے ایسے منطقے کہاں قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ملک کا جو حصہ بچ رہتا ہے اس کو ہندو منطقوں میں تقسیم کر لیا جا سکتا ہے تاکہ ہر دو قومیں اپنے اپنے منطقوں میں محفوظ رہ کر آزادی کیساتھ ایک اتحادیہ میں شامل ہو سکیں۔ چھوٹی قومیں مثلاً عیسائی۔ اینگلو انڈین۔ بدھ اور پارسی جہاں اب ہیں وہیں رہ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے ایسے تہذیبی اختلافات نہیں رکھتیں جو ناقابل مصالحت ہوں۔ ان کو ملک کے دستور کے تحت معقول اور مؤثر تہذیبی تحفظات (Safe Guards.) حاصل رہیں گے یا اگر وہ چاہیں تو ہندو اور مسلم منطقوں میں جہاں بھی ممکن ہو ان کے لئے مراکز (Cantons) مقرر کر دئے جا سکیں گے۔

(ب) ایسے منطقوں کے قیام کے لئے وقت درکار ہے۔ کیونکہ اس کے لئے تبادلہ آبادی ضروری ہے اور یہ تبادلہ ترکی اور یونان کے ۱۹۲۳ء کے تبادلہ آبادی کے اصول پر ایک مقررہ میعاد میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ کام آغاز ہو حدود کا تعین ہو جانا چاہیے۔ تبادلہ آبادی کا مسئلہ آخر کار جائداد کے معاوضہ کا مسئلہ ہوگا جو نقل وطن کرنے والے چھوڑ جائیں گے۔ اس کا تصفیہ متعلقہ حکومتیں آپس میں کر سکتی ہیں۔ اس تبادلہ میں جو لوگ متاثر ہوں گے۔ انکے رجسٹرات کی ترتیب کا کام نیز دو حدوں کے مابین مالی ذمہ داریوں کا تعین عبوری دور میں کیا جا سکتا ہے۔ منطقوں کے تعین کے لئے شاہی کمیشن کا تقرر ضروری ہوگا اور اس کمیشن کے غور کے لئے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری ابتدائی مواد فراہم کر سکتی ہے۔

ہندوستان کیلئے دائمی اتحادیہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ یہ منطقے قطعی طور پر قائم ہو جائیں اور ان کو تہذیبی بنیاد پر متجانس بنایا جائے اس چیز کو آخری مقصد اور ہندوستان کے اتحاد کے مسئلہ کا واحد حل قرار دے کر عبوری دور کے لئے ایسا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے، جو پورے ملک کے

لئے سیاسی اتحاد کی طمانیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب آنے کا موقع نہ دے اور پھر بھی سب کے لئے مطلوبہ متجانس آزاد مملکتوں کے ارتقا کی غرض سے مشترکہ طور پر کوشش کرنے کی اخلاقی ترغیب موجود ہو۔

عبوری دستور اجمالی طور پر فہرست ہذا کے حصۂ سوم میں بیان کیا گیا ہے اور یہی اسوقت ہماری توجہ کا محتاج ہے۔

حصۂ دوم

منطقوں کی تقسیم

مگر عبوری دستور کا خاکہ پیش کرنے کے قبل یہ ضروری ہے کہ ان منطقوں Zones کو اجمالاً بیان کر دیا جائے جو آخر کار قائم ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قطعی حدود کا تعین شاہی کمیشن کرے گا، مگر اس اجمال سے اسکیم کا نصب العین متعین ہوگا اور عبوری دور میں مدد ملے گی۔

مسلم منطقے

موجودہ حالات کے مدِ نظر مسلمانوں کے حسب ذیل منطقے قائم کئے جانے چاہئیں۔

(۱) شمال مغربی علاقہ۔ اس وقت مسلمانوں کا ایک بڑا علاقہ شمال مغربی جانب موجود ہے، جو سندھ۔ بلوچستان۔ پنجاب۔ سرحدی صوبہ۔ کشمیر۔ خیرپور اور بہاول پور پر مشتمل ہے۔ اس پورے رقبہ کو مسلم منطقہ بنایا جاسکتا ہے، جس سے تین کروڑ مسلمانوں کو اپنا ایک مسکن مل جاتا ہے اس رقبہ میں جو ہندو اور سکھ آباد ہیں ان کو اس رقبہ کی ہندو اور سکھ ریاستوں میں جن پر برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ معاہدات کے تحت حکومتیں قائم ہیں یکجا کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کو ایک آزادانہ متجانس وجود عطا کرنے کے لئے کشمیر اور جموں کے حدود میں تھوڑی سی تبدیلی کی جاسکتی ہے اس ریاست میں مسلم آبادی زیادہ ہے اور یہ ریاست یہاں کے ہندو

فرمانروا کو برطانوی حکومت سے مالی معاوضہ میں عطا ہوئی ہے۔ ملک کے دوامی مفاد کی خاطر یہ ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ کو معقول معاوضہ دیکر سابقہ معاملت کا از سرِ نو تصفیہ کیا جائے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ یا تو برطانوی پنجاب کا وہ حصہ جو وادی کانگڑہ کہلاتا ہے اور جس کی آبادی زیادہ تر ہندو ہے مہاراجہ کو دے کر اس کی بجائے ریاست کے ان چند حصوں کو جنمیں مسلمان بکثرت آباد ہیں پنجاب کے حوالہ کیا جائے یا کوئی ایسی تجویز کی جائے جس پر تہذیبی متجانس مملکتوں کے مجوزہ احدیہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فریقین آپس میں متفق ہوں۔ یہاں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ امرتسر کو جو مسلم منطقہ میں واقع ہے سکھوں کا آزاد شہر بنا دیا جائے کیونکہ یہ سکھوں کا اہم مذہبی مقام ہے۔

(۲) شمال مشرقی علاقہ۔ ہندوستان کی دوسری جانب یعنے شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے تین کروڑ مسلمانوں کا ایک مستحکم علاقہ ہے جس کو ایک آزاد سیاسی وجود عطا کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دہلی۔لکھنؤ کا علاقہ ۔ مندرجہ صدر دو علاقوں کے درمیان مسلمان بے تکے پھیلے ہوئے ہیں یہ اپنے سے قریب جو علاقہ ہو اُسمیں توطن پذیر ہو سکتے ہیں۔ باقی جو مسلمان صوبۂ متحدہ اور بہار سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے ان کو ایک نئے علاقہ میں جو صوبۂ متحدہ کی مغربی سرحد سے چل کر لکھنؤ پر ختم ہوتا ہے اور جس میں رام پور کو شریک کر لیا گیا ہے مرتکز کیا جا سکتا ہے۔ یہ منطقہ پنجاب کے مسلم علاقہ کے متصل ہوگا مگر اس میں ہندوؤں کے مذہبی مراکز مثلاً متھرا۔ بنارس۔ ہردوارا اور الہ آباد داخل نہیں رہیں گے۔

(۴) دکن کا علاقہ ۔ وندھیا اور ستپورہ کے جنوب میں مسلمان مختلف وسعتوں کی آبادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بھی ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ ان کے لئے ایک منطقہ قائم کرنیکی ضرورت ہے اس قسم کا منطقہ ممالک محروسہ حیدرآباد اور برار سے بن سکتا ہے مگر اس کے ساتھ جنوب میں ایک تنگ پٹی براہ کرنول و کڑپا مدراس تک لیجانی ہوگی۔ مسلمانوں کا ایک با اثر طبقہ مغربی ساحل کی طرف براہ بیجاپور ایسی راہ کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ راہ مسلمانوں کے ایک وسیع تجارتی

پیشہ اور ملّاح طبقہ کے توطن کے لئے جو صدیوں سے کارومنڈل اور ملابار کے ساحل پر زندگی بسر کرتا چلا آرہا ہے ضروری ہوگا۔

حیدرآباد کو جنوبی مسلم آبادی کے اجتماع کے لئے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت مرکزی ہے اور اس کی مدد سے مندوؤں کے پانچ خودمختار تہذیبی منطقے جو مرہٹوں۔ آندھرون تاملون۔ کنڑون اور ملایالمون کیلئے علیحدہ علیحدہ مختص ہونگے، بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر اس مرکزی مقام سے مسلم منطقہ کو ہٹایا جائے تو ان پانچ ہندو منطقوں میں مداخلت ہوگی جس سے ہندو منطقے منقسم ہوجائیں گے اور ان کی لسانی اور تہذیبی متجانست (Homogenity.) متاثر ہوگی۔ اس وقت تین مختلف قومیں یعنے مرہٹے۔ آندھرے اور کنڑے دکن کے ہر دو جانب اپنے حقیقی وطن سے آگے بڑھ کر اس رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں ان کو اپنے اصل مرکز کی طرف واپس ہوجانا پڑے گا۔ اور وہاں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوگی تاکہ اس درمیانی حصہ میں کل جزیرہ نما (Peninsula.) کے مسلمان جمع ہوسکیں۔

یہ مرکزی حصّہ ایک مسلمان فرمانروا کے زیرنگین ہونے کی وجہ سے یہ تصور نہ کیا جائے کہ محض اس بنا پر اس کو مسلمانوں کا وطن بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ ایسا نہیں ہے یہ بالکل اتفاقی مطابقت ہے اور توقع ہے کہ اس مطابقت سے تصفیۂ آخر میں معتدبہ سہولت ہوگی۔

چھوٹے مسلم مراکز

جو مسلمان مندرجہ صدر چار مسلم منطقوں کے باہر رہتے ہیں مثلاً جنکی بود و باش راجپوتانہ، گجرات مالوہ اور مغربی دیسی ریاستوں میں ہے وہ ان رقبوں کی دیسی ریاستوں میں جمع ہوسکتے ہیں، نیز ایک نئے جدید آزاد شہر اجمیر میں جو اس اسکیم کے تحت مسلمانوں کے لئے تہذیبی بنیاد پر متجانس ہوگا۔

ہندو منطقے

بقیہ ہندوستان کو مختلف زبانوں مثلاً بنگالی۔ ہندی۔ اوریہ۔ راجستانی۔ گجراتی۔ مرہٹی

تلنگی۔ تامل۔ کنڑی اور ملایالم کے اعتبار سے یا جیسا ہندو پسند کریں اس کے مطابق ہندو منطقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

واضح باد کہ ہر تہذیبی منطقہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنی فطری مماثلت کے لحاظ سے برطانوی علاقہ اور دیسی ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر ایسا منطقہ ایک متجانس مملکت ہوگا اور جہاں کسی منطقہ میں ایک سے زیادہ وحدتیں ہوں اس کی حکومت اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہوگی مگر وہ کُل ہند احدیہ میں دوسری ریاستوں کے ساتھ مطابقت رکھے گی۔

تحفظات

احدیہ کے دستور میں حسب ذیل تحفظات رکھے جائیں گے۔

(۱) قانون اقوام ہند (Public Law of Nations.) مختلف اقوام کے افراد ایسے رقبوں میں جن سے ان کا تعلق نہ ہو خاص اغراض کے لئے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ان افراد کو ہندوستانی اقوام کے قانون کے تحت جس کو مرکزی حکومت منظور کرے گی، شخصی حفاظت اور شہری حقوق حاصل رہیں گے۔

(۲) مذہبی معابد۔ متروکہ رقبوں کی جملہ مذہبی عبادت گاہوں، یادگاروں اور قبرستانوں کی نگرانی و نگہداشت خواہ وہ ہندوؤں کے علاقہ میں ہوں یا مسلمانوں کے، احدیہ کے متعلقہ منطقہ کی حکومت مرکزی حکومت کی نگرانی میں کریگی

(۳) عیسائی۔ پارسی اور بدھ مذہب کے پیرو۔ چھوٹی قوموں مثلاً عیسائی اینگلو انڈین۔ پارسی اور بدھ مذہب کے پیروؤں کو خواہ وہ مسلم سلطنت میں ہوں یا ہندو سلطنت میں وہ تمام مذہبی اور تہذیبی تحفظات عطا کئے جائیں گے جو اپنی انفرادیت (Individuality.) کو برقرار رکھنے کے لئے وہ طلب کریں اور اگر وہ چاہیں تو اُن کو مراکز (Cantons.) کے مطالبہ کا بھی حق حاصل رہے گا۔

(۴) ہریجن - مختلف پست اقوام اور اچھوت جن کو ہریجن کہا جاتا ہے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں - ان میں مختلف نسلی اختلافات ہیں۔ ان کی کوئی مشترکہ تہذیب نہیں ہے نہ یہ زمیندار ہیں۔ لہذا ان کو اس بات کی کامل آزادی حاصل رہے گی کہ وہ ہندو اور مسلم علاقوں میں جہاں چاہیں مستقلاً وطن پذیر ہوں ، اور یہاں انہیں عیسائیوں - اینگلو انڈینوں - بدھوں اور پارسیوں کی طرح کامل شہری حقوق حاصل رہیں گے۔

یہ اس صورت کا ایک وسیع خاکہ ہے جو تہذیبی متجانس مملکتوں کا احدیہ آخرکار اختیار کریگا نظر بریں عبوری دور کو چند منازل میں منقسم کرنا ہوگا تاکہ اس مقصد تک بتدریج رسائی ہو۔ چنانچہ حصۂ سوم میں ابتدائی منزل کو پیش کیا گیا ہے جس پر فوری عمل ضروری ہے۔

حصۂ سوم

دستور عبوری

ہندوستان کا عبوری دستور ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ اس احدیہ کی تصویر میں بیٹھ سکے جسکو حصۂ دوم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت وفاق کی سی ہو بشرطیکہ مرکز کے اختیارات کو اقل درجہ تک گھٹا دیا جائے۔ مگر اس وفاق کو ایسی وحدتوں پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کو آگے چل کر مطلوبہ تہذیبی منطقوں میں منسلک کیا جا سکے۔ اس کے لئے فوری تبادلہ آبادی کے بغیر تہذیبی یا لسانی اصول پر چند نئے صوبجات کے قیام کی ضرورت ہے نئے صوبجات کو جزوی طور پر بھی قائم کیا جا سکتا ہے، لیکن ان میں سے ایک صوبہ کو موجودہ صوبہ متحدہ سے فوراً تراشنا پڑے گا اور اس کا مرکز لکھنؤ ہوگا۔ اس صوبہ کی تشکیل اس مقصد کے پیش نظر ہونی چاہیئے کہ وہ آئندہ چل کر صوبہ متحدہ اور بہار کے مسلمانوں کا مستقل مسکن اور مسلم منطقہ ہوگا۔

وفاق عبوری

Transitional Federation.

یہ دستوری ماہرین کا کام ہے کہ وہ عبوری دستور کی تفصیلات کو مرتب کریں لیکن جو بھی دستور مرتب ہو اس میں حسب ذیل شرائط رہنے چاہئیں۔

(۱) تمہید میں یہ صاف طور پر بتادیا جانا چاہیئے کہ عبوری وفاق کے دستور کا مقصد ہندوستان میں تہذیبی مجالس آزاد مملکتوں کے احدیہ کا قیام ہے۔

(۲) قانون سازی Legislation.

(الف) وفاقی مجلس مقننہ (Federal Legislation.) کی فہرست کو اقل درجہ تک گھٹا دینا چاہیئے اور صرف ان مدات تک محدود کر دینا چاہیئے جن کا تعلق ملک کے مشترکہ سیاسی اور معاشی مفادات سے ہو۔

(ب) بقیہ مدات صوبہ واری فہرست میں بشرائط ذیل داخل رہیں گے۔

منطقی مجالس Regional Boards.

بعض ایسے تہذیبی اور معاشی معاملات ہو سکتے ہیں جو ملحقہ وفاقی وحدتوں ..... (Contiguous Federal Units.) کے نزدیک مشترکہ اہمیت رکھتے ہوں۔ ان کے لیے منطقی مجالس مفید ہوں گے تاکہ ایک مشترکہ پالیسی تجویز کی جائے اور وفاقی وحدتوں کو اس مشترکہ پالیسی کی رہنمائی میں حسب صوابدید خود ضروری قوانین بنا لینے کی اجازت دیدی جائے۔ ایسے تین منطقے حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) شمال مغربی منطقہ جو سندھ، بلوچستان۔ صوبہ سرحدی، کشمیر۔ خیرپور اور علاقہ پنجاب کی دیسی ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔

(۲) شمال مشرقی منطقہ جس میں بنگال اور آسام شامل ہونگے۔

(۳) ممالک محروسہ حیدرآباد و برار۔

اس ترتیب کے دو فوائد ہیں۔

(۱) اس کی بدولت تہذیبی قانون سازی، وفاقی اقتدار سے خارج ہو جائے گی۔

(۲) اس سے ایک منطقی شعور پیدا ہوگا جو تہذیبی خودمختار (Culturally Autonomous) مملکتوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہے۔

مسلمانوں کے تحفظات

عبوری وفاقی دستور کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، خواہ وہ جدید وحدتوں پر مشتمل ہو جسکی صراحت اُوپر کی گئی ہے یا اس میں وہی وحدتیں ہوں جو اس وقت موجود ہیں، بہرحال مسلمانوں کو دستور میں حسب ذیل تحفظات کی ضرورت ہوگی۔

(الف) مجالس مقننہ میں نمایندگی

(۱) مسلمانوں کے لئے جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب (Separate Electorates.) کا طریقہ قائم رہے گا، نیز وہ تناسب بھی جو اس وقت مسلمانوں کو مختلف مجالس مقننہ (Legislatures.) میں حاصل ہے۔

(۲) کل ہند وفاق میں دیسی ریاستوں کی شرکت اس امر کی تابع ہونی چاہیئے کہ مرکز میں موجودہ تناسب کو قائم رکھنے کے لئے وہ مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کی کافی تعداد روانہ کریں

(۳) اگر مجوّزہ منطقی مجالس قائم ہوں تو ان میں مسلمانوں کی نمائندگی معقول اور مؤثر اور اس قوت کے متناسب ہونی چاہیئے جو اُن کو ہر منطقہ کی مختلف وحدتوں کی مجالس مقننہ میں مجموعی طور پر حاصل ہو۔

(ب) قانونسازی

ایسے امور جن کا تعلق مذہب، شخصی قانون اور تہذیب سے ہو وہ مقننہ متعلقہ کے مسلم ارکان کی خاص کمیٹی کے زیر اقتدار رہیں گے۔ اس کمیٹی کی تعداد میں یک ثلث کی حد تک اضافہ کے لئے ایسے مسلم نمائندوں سے بذریعہ انتخاب اشتراک عمل کیا جا سکتا ہے، جنکو قانون اسلام

اور مذہبی امور پر عبور حاصل ہو۔ اس کمیٹی کے فیصلوں کو پوری مجلس مقننہ تسلیم کرے گی۔ اگر یہ فیصلے دوسری اقوام کے مفادات کو متاثر کرتے ہوں تو نظم ونسق کے اعلیٰ عہدے دار کی ایما پر مجلس مقننہ میں ان پر غور ہو سکے گا، لیکن کوئی ایسی ترمیمات کی اجازت نہ ہوگی جو مجوّزہ قانون کی بنیاد پر اثر انداز ہو۔

(ج) - عاملہ - Executive.

حکومت عاملہ یا وزارتیں خواہ صوبہ میں ہوں یا مرکز میں غالب جماعت سے ترتیب نہیں دیجائیں گی، جیسا کہ متجانس جمہوری (Homogeneous Democratic.) ممالک مثلاً انگلستان میں رواج ہے۔ ہندوستان میں صرف اکثریتی قوم Majority Nationality. ہی مجالس مقننہ کے اراکین کی غالب تعداد کا مستقلاً انتخاب کرتی ہے اور چونکہ یہ غالب قوم - جو ہندوؤں پر مشتمل ہے، ملک کی دوسری بڑی قوم یعنی مسلمانوں سے نہ صرف زندگی کے بنیادی امور اور نقطۂ نظر بلکہ خانگی اور سماجی زندگی کی جزویات میں تک اختلاف رکھتی ہے اس لئے مجلسِ مقننہ میں مستقل اکثریت کی حکومت بالفاظ دیگر غالب طبقہ کی حکومت بنجاتی ہے اور جیسا کہ چاہیئے پوری رعایا کی حکومت نہیں تصوّر کی جا سکتی۔

موجودہ نوبت پر ہر صوبہ نیز مرکز میں ایسے عاملہ کی ضرورت ہو جو مخلوط ہو یعنے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو نمائندگی حاصل رہے جس کی پالیسی ہر دو فریق کے لئے قابلِ قبول ہو اور جسکو مقننہ علیٰحدہ نہ کر سکے۔ یہ انتظام کم از کم اس وقت تک رہنا چاہیئے جب تک کہ ہندوستان تہذیبی متجانس اور آزاد مملکتوں کے اتحادیہ میں تحویل نہ ہو جائے کیونکہ ملک میں اُسی وقت حقیقی جمہوریت پیدا ہو سکتی ہے اور ذمہ دارانہ حکومت کا قیام حق بجانب ہو سکتا ہے۔

نظر برین عبوری دستور کے تحت جو عاملہ مقرر ہوگا وہ انگریزی نوعیت کا پارلیمنٹری عاملہ (Parliamentary Executive.) نہیں بلکہ مقننہ سے آزاد مستحکم عاملہ (Stable Executive Independent of Legislature.)

ہونا چاہیئے ، جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ میں ہے مگر یہاں کے وزیر اعظم کا انتخاب امریکہ کے صدر جمہوریہ کی طرح رعایا کی جانب سے براہِ راست عمل میں نہ آنا چاہیئے ۔ بلکہ مقننہ کے اراکین کی جانب سے کیا جانا چاہیئے ۔ منتخبہ وزیر اعظم صرف انتخاب کنندہ مقننہ کی میعاد میں برسرِ خدمت رہیگا ۔ مگر مقننہ کو اس کی علیٰحدگی کا اختیار نہ ہوگا ۔ وزیر اعظم اپنے رفقا یا وزرا کا انتخاب اچھی حکومت کی خاطر مقننہ کی جملہ جماعتوں سے کریگا اور منتخب وزرا میں ایک مناسب تعداد ایسے مسلمانوں کی ہوگی جنکو مقننہ کے مسلم اراکین کا اعتماد حاصل ہو اور جن کو ان مسلم اراکین کی مجوزہ فہرست (.Panel) سے منتخب کیا جائے ۔

جن دو صورتوں میں ہندوستان کو فی الحال منقسم کیا جائے گا ۔ ان میں سے ایک یعنی صوبہ لکھنؤ کا وزیر اعظم مسلمان ہونا چاہیئے کیونکہ اس رقبہ کو عبوری دور میں مسلم منطقہ کیلئے تیار کرنا ہے اور اس لحاظ سے اس صوبہ کی پالیسی کسی مسلمان کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے ۔

سررشتہ جات امن عامّہ و تعلیم میں جن کو ایسے مسائل سے تعلق ہوتا ہے جن کے تحت تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں ، ایک وزیر اور ایک نائب وزیر کے عہدے قائم کئے جانے چاہیئں اور ان میں سے کسی ایک پر مسلمان کا تقرر ہونا چاہیئے ۔ تاکہ حکومت اس کی مدد سے اعتدال پر قائم رہے ۔

(د) پبلک سروس کمیشن

دستور میں یہ تجویز کی جانی چاہیئے کہ ان تمام صوبہ جات میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں نیز مرکز میں پبلک سروس کمیشن کا کم از کم ایک رکن مسلمان ہوگا اور اس کا فرض ہوگا کہ وہ دیکھے کہ پبلک خدمات میں مسلمانوں کی مقررہ شرح کو عملاً برقرار رکھا جا رہا ہے یا نہیں ۔

(ہ) ۔ عدلیہ ۔ .Judiciary

مسلمانوں کے شخصی قانون کے تحت فیصلہ جات مسلم حکام کرینگے ۔

(و) مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کیلئے مجلس کا قیام

دستور میں یہ شرط ہونی چاہیئے کہ ہر صوبجاتی وحدت میں مسلمانوں کی ایک مجلس اس غرض سے قائم کی جائیگی کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے تہذیبی پہلو کی نگرانی کرے ، ان کی فنی اور صنعتی تربیت کا

اہتمام کرے اور ان کی معاشی اور سماجی اصلاح کی تدابیر سوچے ۔ اس کے لئے موازنہ میں ایک مناسب رقم شریک کی جانی چاہیئے ۔

(س) خصوصی محصول ۔ Special Taxation.

اگر مسلمان کسی خاص غرض سے اپنے اوپر کوئی محصول عائد کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری قانون پاس کیا جائے گا ۔

انتظام برائے تبادلہ آبادی

عبوری دستور کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے مقررہ منطقوں میں منتقل ہونے کے لئے زمین تیار کی جائے اور ان کو سہولتیں بہم پہونچائی جائیں تاکہ یہ منطقے تہذیبی خود مختار مملکتیں بن سکیں ۔ دور عبوری میں منتقلی خود اختیاری ہوگی ۔ اس کے لئے ہر منطقہ میں ضروری قوانین بنائے جانے چاہئیں ، اور منتقلی کے انتظام کیلئے مشنری کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیئے چنانچہ مجوزہ دستور میں ایک شاہی کمیشن کے تقرر کی تجویز ہونی چاہیئے تاکہ یہ کمیشن تدریجی تبادلہ آبادی کا نظام العمل مرتب کرے ۔

خود اختیاری منتقلی کی وقتاً فوقتاً تنقیح کی جانی چاہیئے اور اگر یہ معلوم ہو کہ اس سے ہندو اور مسلمانوں کے مابین تہذیبی مناقشات میں لائق لحاظ تخفیف ہوگئی ہے یا ان کو جہاں کہیں وہ ہیں اپنی حفاظت کا اطمینان ہوگیا ہے یا اس اثنا میں فریقین میں تالیف قلب ہوگئی ہے تو جبری تبادلہ کو غیر معین مدت کے لئے ملتوی کر دیا جانا چاہیئے اور خود اختیاری منتقلی کے طریقہ کو مزید عرصہ کے لئے جاری رکھا جانا چاہیئے +

نوٹ :- خریدارانِ رسالہ سے التماس ہے کہ خط و کتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں ۔ (منیجر)

واردھا تعلیمی اسکیم اور جمعیّت علمائے ہند

(ہم نے گذشتہ مارچ کے پرچہ میں لکھا تھا کہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ دہلی میں واردھا تعلیمی اسکیم کی تردید میں بڑے واضح اور کُھلے کُھلے الفاظ میں ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ وہ ریزولیوشن اس کمیٹی کی رپورٹ پر مبنی تھا جو جمعیت کی طرف سے اس غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ یہ رپورٹ اب جمعیت کی طرف سے شائع ہو چکی ہے جو درج ذیل ہے۔ حق کی آواز میں کس قدر قوت ہوتی ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ وہ آواز جو واردھا اسکیم کے خلاف ہم نے اگست ۱۹۳۸ء میں اٹھائی تھی اور جسے دبانے کے لئے مخالفتوں کا ہجوم پنجۂ استبداد بنکر ہمارے گلوگیر ہو رہا تھا۔ لرزتی۔ کانپتی آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ اور بالآخر صورِ اسرافیل کی شکل اختیار کر گئی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔ ہم قارئین سے گذارش کرینگے کہ اس رپورٹ کے مطالعہ کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ان مضامین پر نگاہ ڈال لیں جو واردھا اسکیم کے سلسلہ میں طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تاکہ حقائق زیادہ نمایاں طور پر سامنے آجائیں۔ طلوع اسلام)

رپورٹ سب کمیٹی واردھا تعلیمی اسکیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ——— نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہم نے واردھا تعلیمی اسکیم پر غور کیا۔ اول اجمالی طور پر ہم اس کے مفصلہ ذیل بنیادی اصول پر بحث کرتے ہیں۔

(۱) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ (۲) نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی۔ دستکاری بھی سکھائی جائے۔ بلکہ دستکاری ہی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ (۳) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازم کرنا۔

(۴) بچوں کے ذہن میں ابتداہی سے رواداری اور روشن خیالی پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کرنا اور ان کو تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مفید شہری اور کارگزار انسان بنانا۔

مقدم الذکر تین اصول تو بلاشبہ مستحسن اور قابل قبول ہیں۔ البتہ چوتھا اصول اگر اسی قالب میں ہوتا جس میں ہم نے اسے ذکر کیا ہے تو وہ اصول ثلاثہ متقدمہ کی طرح مستحسن اور قابل قبول تھا لیکن جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے اس چوتھے اصول کو اپنی رپورٹ کے ص۱۱۱ و ص۱۱۸ و ص۱۱۹ (طبع ثانی از رسالہ جامعہ) میں ذکر فرمایا ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ ان کی عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ آیندہ ہندوستان میں اس اسکیم کے ماتحت تعلیمیافتہ ایک تہذیب اور ایک قسم کے عقائد اور مشابہ اعمال کے پابند ہوں وہ تمام مذاہب کی عزت کریں (یعنی تمام مذاہب کو سچا سمجھتے ہوں؟) اور ان میں مذہبی لحاظ سے کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ نیز وہ اہمسا کی حقانیت کے معتقد اور اس پر عامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ اصول نہ صحیح ہے نہ قابلِ عمل ہے۔ اور اس میں ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مختلف رجحانات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا اور چیز ہے اور مختلف (بلکہ متضاد) مذاہب کو صحیح اور حق سمجھنا بلکہ سب کو ایک سمجھنا اور شے ہے۔ یہ بات تو دو ہندو فرقوں مثلاً سناتن دھرمیوں اور جینیوں میں بھی متحقق الوقوع نہیں پھر غیر مسلموں اور مسلمانوں میں کس طرح اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے عدم تشدد کو اپنے موجودہ ماحول کی وجہ سے بطور پالیسی اختیار کر لیا تھا اور اب تک اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآنِ حکیم کی آیاتِ جہاد کو بھول گئے یا چھوڑ بیٹھے اور تشدد کو اگرچہ وہ ضروری مواقع میں اختیار کیا جائے گناہ اور پاپ سمجھنے لگے۔ نیز یہ لفظ ایسے انداز سے ذکر کیا گیا ہے جس سے خطرہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذہنوں میں اسکا مفہوم "جیو ہتھیا" کے معنی میں بیٹھ جائیگا۔ یا بٹھا دیا جائیگا جسکا اثر مسلمانوں کے ایک خاص معاشرتی اور مذہبی عمل ذبح حیوانات پر بھی پڑیگا۔ اور آیندہ ہندوستان میں یہی ایک چیز ہمیشہ منشأ نزاع بنی رہیگی اور اگر خاکم بدہن یہ اسکیم اس معنی سے کامیاب ہوگئی کہ بچوں کے دماغ میں ابتدا ہی سے ذبح حیوانات

اور عقیدۂ جہاد سے نفرت بیٹھ گئی اور سب کے سب انسان اس کو مذموم سمجھنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں کا ایک مذہبی عقیدہ بدل دیا اور اُن کے ایک معاشرتی اور مذہبی حق کو باطل کر دیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بے شمار مختلف مذاہب موجود ہیں بغیر باہمی رواداری کے زندگی گذارنا مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ متحدہ قومیت کا یہ تخیل کہ مسلمان بھی اپنی خالص اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر کسی ایسی تہذیب میں مدغم ہو جائیں گے جس میں اسلامیت اور غیر اسلامیت کا امتیاز نہ ہو اس سے زیادہ مشکل اور بداہتہً محال ہے۔ مسلمان ایسی رواداری کہ جس میں مختلف اور متضاد مذاہب کے لوگ امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں اختیار کرنے اور برتنے کے لئے نہ صرف تیار ہیں بلکہ ان کی قدیمی روایات اس کی شاہد ہیں اور اس کے خلاف انکو کسی ایسی متحدہ قومیت کا درس دینا جس میں اسلامی تہذیب کے نقوش بھی مٹ گئے یا مٹا دئے گئے ہوں نہ صرف فضول بلکہ فتنہ و فساد کی بنیاد ڈالنا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رپورٹ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اُن میں سے مفصلۂ ذیل امور قابلِ ترمیم و اصلاح ہیں۔ اُن کی تفصیل سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ناقابل تزلزل عقیدہ اور یقین راسخ یہ ہے کہ ان کا دین اسلام۔ ان کے ایمان اور اعمال اور معاشرت اور تمدنی زندگی کے تمام اصول و فروع کو حاوی ہے۔ ان کی اسلامی تہذیب ممتاز ہے اور اس کی حفاظت کے لئے اسلامی کلچر کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی اس کے لئے تیار نہیں کہ اسلامی تعلیم و تہذیب کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کو اختیار کریں۔ وہ سیاسی آزادی سے مذہبی آزادی کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جو ان کے اسلامی عقائد یا اعمال یا معاشرت پر مخالفانہ اثر ڈالے۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ یا ساڑھے سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اتنی بڑی قوم کی ضروریات کو نظر انداز کر کے کوئی حکومت سرسبز نہیں ہو سکتی اور تعلیم کا مسئلہ تو ایک بنیادی مسئلہ ہے جس پر قوم کے تمام ذہنی نشوونما کا مدار ہے۔ اس لئے کوئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک مقبول اور کامیاب نہیں ہو سکتی جس پر مسلم قوم کے تعلیمی ادارے اور مذہب کے ماہرین اطمینان ظاہر نہ کریں۔

ہمیں افسوس ہے کہ وارد ھا تعلیمی اسکیم پر کسی ذمہ دار مذہبی مسلم تعلیمی ادارے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور مسلمانوں کی مذہبی جماعت جمعیۃ العلماء سے بھی استصواب نہیں کیا گیا یہ ایک اصولی غلطی ہے جس کا جلد از جلد ازالہ کر دینا لازم ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اس اسکیم میں حسب ذیل امور کی اصلاح لازم ہے۔

(۱) لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم نہ ہو۔

(۲) جداگانہ لڑکیوں کے سکول میں بھی لڑکی پر ۱۲ سال کی عمر کے بعد جبری حاضری کی پابندی قبول نہیں کی جاسکتی۔

(۳) مسلمان بچوں کو گانے بجانے اور تال سُر کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔

(۴) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو تصویر کشی یعنی جاندار کی تصویریں بنانا اور سیکھنا جائز نہیں۔

(۵) مسلمان لڑکوں کو اگر وہ جبری تعلیم کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہوں جبری تعلیم سے مستثنیٰ کر دینا لازمی ہوگا۔

ان کے علاوہ اسکیم میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مذہبی تعلیم کے لزوم کو ضروری سمجھتے ہیں اور مسلمان لڑکیوں کے لئے امور خانہ داری اور گھریلو صنعتوں کی تعلیم کا خاص انتظام چاہتے ہیں۔ یعنی کورس کی ترتیب کے وقت اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ لڑکوں کا کورس لڑکوں کے مناسب حال ہو اور لڑکیوں کا کورس اُن کے لائق ہو۔ یہ بھی لازم ہے کہ تعلیم کی پوری اسکیم میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو مسلمانوں کے مذہب کے خلاف ہو۔ مثلاً کسی مجسمہ کی تعظیم کرانا یا غیر اسلامی طریق پر پرارتھنا کرانا یا کوئی غیر اسلامی گیت گانا وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں ہم جمعیۃ العلماء سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ وارد ھا تعلیمی اسکیم کے متعلق حسب ذیل مضمون کی تجویز پاس کر دے۔

مضمون تجویز | جمعیۃ العلماء ہند وارد ھا تعلیمی اسکیم کو قابلِ ترمیم و اصلاح سمجھتی ہے۔

اوراس کے ذمہ دار اصحاب سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جمعیۃ العلمار کی منظوری اور اظہار اطمینان کے بغیر آٹھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کوئی اسکیم نافذ نہ کرے۔ ورنہ مسلمان اسے قبول نہ کریں گے۔ اور ملک میں اختلاف وانتشار پیدا ہونے کی ذمہ واری اسکیم وضع کرنے والوں اور چلانے والوں پر عائد ہوگی۔

محمد کفایت اللہ — ابوالمحاسن محمد سجاد — فقیر احمد سعید

کان اللہ لہٗ — کان اللہ لہٗ — کان اللہ لہٗ

ہم رپورٹ کے تمام اجزا سے کلی اتفاق رکھتے ہیں مگر مذہبی تعلیم کے بارے میں یہ جداگانہ رائے رکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کا انتظام مشترک حکومت کے ہاتھوں مفید نہیں ہے اسلئے مشترک تعلیمی اداروں کی بجائے مسلمانوں کے اپنے انتظام سے ہونا چاہئے۔ البتہ ایسے اسلامی مکاتب کے اجرا کے لئے حکومت سے بھی امدادی رقوم منظور کرائی جائیں اور خود بھی انتظام کریں۔ نیز اس اسکیم کے نفاذ کے ساتھ ساتھ یہ بھی تصریح کردی جائے کہ جن مسلم پرائیویٹ مدارس میں مذہبی تعلیم دی جارہی ہے وہ اگر اس اسکیم کی منظور شدہ تعلیمی نصاب کو شامل کرلیں تو اُن مدارس کے بچوں کو سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ — نور الدین بہاری

تجویز ورکنگ کمیٹی نمبر ۹

جمعیۃ علمار کا یہ اجلاس واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق سب کمیٹی کی اکثریت کی رپورٹ منظور کرتا ہے اور اسکیم میں کمیٹی کی رائے کے موافق اصلاح وترمیم ضروری سمجھتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کوئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک منظور نہیں کی جاسکتی جب تک وہ نقائص مذکورہ سے صاف نہ ہو اور جمعیۃ علمار اس کی تصدیق نہ کردے۔

تقریظ و تبصرہ

پیام امین

مصنفہ مولانا محمد عبداللہ صاحب منہاس۔ شائع کردہ شرکت ادبیہ شریف گنج۔ امرتسر چھوٹی تقطیع صفحات ۲۰۴۔ طباعت۔ کتابت۔ جلد دیدہ زیب۔ قیمت فی جلد عہ علاوہ محصول ڈاک

قابل مصنف نے اس چھوٹی سی کتاب میں قرآن کریم کے متعلق بہت سی مفید معلومات جمع کر دی ہیں جو انکی وسعتِ مطالعہ دقتِ نظر۔ اور محنتِ شاقہ کی آئینہ دار ہیں۔ شروع میں عہد رسالتمآب صلعم اور قرنِ اولے میں قرآن کریم کی کتابت۔ حفاظت اور اشاعت کی مختصر داستان درج ہے۔ اسکے بعد مختلف ممالک میں اشاعت قرآن کی تاریخ ہے۔ پھر قرآنِ کریم کے متعلق مشرقی و مغرب کے غیر مسلم اربابِ علم کی آراء جمع کیگئی ہیں۔ ازاں بعد یہ بتایا گیا ہے کہ خود قرآن کریم میں قرآن کے متعلق کیا آیا ہے۔ آخیر میں تعلیماتِ قرآن کے متعلق غیر مسلم محققین کے اقوال درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ کتاب اس مقصد کے ماتحت لکھی گئی ہے کہ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ" اس لئے غیر مسلم حضرات کے اقوال و آراء کے لئے بہت زیادہ حصہ وقف کیا گیا ہے۔ ہم لائق مصنف سے درخواست کرینگے کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں جمع و حفاظتِ قرآن کریم کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کچھ ابواب کا مزید اضافہ فرمادیں۔ کتاب بہر حال مفید ہے اور اچھی معلومات کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ ایک فقرہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ لکھا ہے کہ "حضرت عثمانؓ نے ..... سورتوں کو ترتیب دیکر فتنہ تحریف کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا" سورتوں کو حضرت عثمانؓ نے ترتیب نہیں دیا بلکہ ترتیب آیاتِ و سور بحکم خداوندی خود نبی اکرم نے فرمائی تھی۔

مسئلہ قومیت

ہمارے محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی دنیائے صحافت و سیاست میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور آپ بہ حیثیت مدیر ترجمان القرآن ملت اسلامیہ کی اصلاحِ فکر و نظر کے متعلق جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ بھی ارباب بصیرت سے چھپی ڈھکی نہیں۔ رسالہ زیر نظر ان کے ان گرانبہا مضامین کا مجموعہ ہے جو مسئلہ قومیت کے متعلق وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق مولانا صاحب کا مسلک وہی ہے جس کی تائید کتاب و سنت سے ہوتی ہے اور جس کی اشاعت کی سعادت طلوع اسلام کو بھی حاصل ہے۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت عام ہو کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سیلابِ بلا کو روکنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں جن میں مسلمانانِ ہند کو بہالے جانیکی انتہائی کوشش ہو رہی ہیں اور جن کوششوں میں ہماری بدبختی سے خود ہمارے بھی چند بھائی شامل ہیں۔

رسالہ۔ ترجمان القرآن کی تقطیع کے ۶۴ صفحات پر چھپا ہے۔ کتابت۔ طباعت کاغذ اور ٹائیٹل جناب مصنف کے حسنِ ذوق اور شائستگیٔ مذاق کا ثبوت ہیں۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ۔ لاہور سے بقیمت ۵ (مع محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

مفتاح العربیہ۔ یعنی کلام عربی۔ دو حصہ

ایک مسلمان کے نزدیک زبانِ عربی کو جو رتبہ اور اہمیت حاصل ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مسلمان۔ گو ناگوں اسباب و علل کے ماتحت۔ جسطرح صحیح اسلام سے دور ہٹتے گئے۔ عربی زبان بھی ان کے لئے رفتہ رفتہ اجنبی زبان بنتی گئی۔ لیکن حالات پھر کچھ مساعد نظر آرہے ہیں۔ اور کارواں کے دل میں پھر سے احساس زیاں کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی خواں "مغرب زدہ" طبقہ بھی اب رفتہ رفتہ عربی سے مانوس ہونیکی ضرورت محسوس کر رہا ہے لیکن انہیں شکایت ہے کہ عربی زبان بڑی مشکل ہے۔ اسکی گرامر بڑی پیچیدہ ہے۔ اس شکایت کے وجوہ کچھ ہی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ عربی زبان سیکھانے کا جو طریق ہمارے ہاں مروج ہے اس سے یقیناً یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس زبان کا سیکھنا آسان کام نہیں۔ بارے الحمد کہ بعض علم دوست حضرات کو اس امر کا احساس پیدا ہوا ہے اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ عربی گرامر کو آسان اور دلچسپ طریقہ سے پیش کیا جائے۔ اور اس طرح دلوں سے یہ خیال نکالدیا جائے کہ عربی زبان ہوا ہے۔ ان حضرات میں جناب قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی بھی ہیں۔ جنکی ذات ادبی حلقہ میں محتاجِ تعارف نہیں۔ زیر نظر رسائل انہی کی تالیف ہیں حصہ اول میں صرف و نحو کے ضروری قواعد کی عملی تعلیم دی گئی ہے اور ایسے الفاظ جو روزانہ ضروریات زندگی سے متعلق ہیں۔ جملوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اخیر میں اردو سے عربی کی ایک مختصر سی ڈکشنری بھی دی گئی ہے۔ حصہ دوم میں عربی ادب کی قدیم وجدید کتابوں سے مفید اور دلچسپ لطائف و حکایات درج کیگئی ہیں۔ نیز عربی اخبارات کے اکثر اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ اور اخیر میں عربی سے اردو کی مختصر سی ڈکشنری بھی ملحق ہے۔ کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے مفید ہے۔ لیکن ہم قاضی صاحب کی خدمت میں عرض کرینگے کہ انہوں نے "صبح نو بجے سے شام کے پانچ تک دفتر کے کاغذات سے سر مارنے والے" طبقہ کو زیادہ پیش نظر نہیں رکھا۔ انگریزی خواں طبقہ کے لئے عربی سیکھانے کی جو کتاب بھی لکھی جائے۔ اس کی مفید ترین صورت یہ ہو سکے گی کہ عربی گرامر کو انگریزی گرامر کے ساتھ ساتھ چلایا جائے

اور گرامر میں جہاں جہاں اضافے آئیں ۔انہیں واضح کیا جائے ۔ایسے تقابل کے بغیر اس طبقہ میں عربی گرامر مشکل اپنا گھر کر سکے گی ۔ بہرحال قاضی صاحب کی موجودہ کوشش مستحق شکر یہ ہے طباعت کتابت ۔کاغذ ۔سرورق عمدہ ۔بقیمت ۱۰ ار فی حصہ ۔مکتبۂ علمیہ میرٹھ سے حاصل کریں ۔

بلاغ اور ۔ البیان ۔ امرتسر

امت مسلمہ امرتسر کا ماہوار رسالہ بلاغ ایک عرصہ سے شائع ہو رہا تھا ۔ یہ ایک مختصر سی جماعت ہے ۔لیکن بدبختی کہ اس میں بھی اتحاد نہ رہ سکا ۔ چنانچہ ڈاکٹر علم الدین صاحب رسالہ بلاغ کو لے کر الگ ہو گئے ۔ اور امت مسلمہ کی طرف سے جناب عرشی صاحب کے زیر ادارت البیان ایک نیا ماہوار صحیفہ شائع کیا گیا ہے ۔ بلاغ تو طباعت ۔کتابت ۔ضخامت کے اعتبار سے پہلی سطح سے بھی نیچے گر گیا ہے ۔لیکن البیان اس اعتبار سے سابقہ بلاغ سے بلند ہو گیا ہے ۔اس جماعت کے عقائد سے مسلمان واقف ہیں ۔اور نبی اکرمؐ کی صحیح حیثیت کے پہچاننے میں جو غلطی انہوں نے کی ہے وہ سب پر عیاں ہے لیکن ان پرچوں میں ایسے حضرات کے مضامین بھی موجود ہیں جو اس جماعت سے عقائد میں مختلف ہیں ۔یہ عرشی صاحب کی ہمت ہے کہ انہوں نے ایسے نامساعد حالات کے باوجود سابقہ بلاغ سے بھی عمدہ پرچہ شائع کر دیا ۔دونوں پرچوں کا الگ الگ سالانہ چندہ تین روپیہ ہے ۔

انیسِ نسواں ۔ دہلی

اس نام کا ایک زنانہ رسالہ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور انکی بیگم صاحبہ کی ادارت میں گذشتہ جنوری سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔یوں تو مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی روز افزوں ترقی کے ساتھ زنانہ رسائل کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور اس وقت تک بہت سے معیاری رسالے جاری ہو چکے ہیں لیکن ہمارے اکثر زنانہ رسالے مغربی تعلیم کا نتیجہ ہیں اور اسی لئے مغربی تہذیب و تمدن سے بہت کچھ متاثر ہیں ۔ان کے سامنے مشرقی عورت کی ترقی کا معیار بالکل یا ذرا سی ترمیم کے ساتھ وہی ہے جسکا نمونہ مغرب کی آزادی پسند عورت پیش کرتی ہے ۔لہذا البعض تو کھلے بندوں ہماری نسوانی دنیا میں تہذیب فرنگ کی تبلیغ و اشاعت کرتے رہتے ہیں لیکن بعض ایسے

رسائل جو مشرقی نسوانیت کی علمبرداری بھی کرتے ہیں بالعموم کسی واضح نصب العین کے نہ ہونے کے باعث غیر محسوس طور پر مغربیت کی طرف پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ انیس نسواں تمام زنانہ رسائل سے الگ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور ایک نمایاں کمی کو پورا کرتا ہے۔ اس نے قرآنِ پاک کے مقرر کردہ معیار کو سامنے رکھکر خواتین اسلام کو خالص اسلامی زندگی کی طرف متوجہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ کام جسقدر مبارک ہے اسی قدر نازک بھی ہے لیکن اسوقت تک کے چار پرچوں میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ بہت کچھ قابل اطمینان اور امید افزا ہے

رسالہ کی ظاہری صورت بھی دیدہ زیب ہے۔ سائز بھی طلوع اسلام کا ہے۔ سرورق خوشنما ہے۔ رسالہ بہ اختلاف کاغذ دو قسموں میں نکلتا ہے۔ قسم اوّل کا سالانہ چندہ ۵؎ روپے اور قسم دوم کا ۳؎ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ انیس نسواں۔ دریا گنج۔ دہلی۔

افادۂ عام

کی غرض سے ہم نے ہر دلعزیز مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز کا مضمون "اسلام اور مذہبی رواداری" علیحدہ شائع کر دیا ہے۔ دفتر سے طلب فرمائیں۔ قیمت ار صرفہ ڈاک ۰ر

رسید کتب

(۱) **ہمارا قومی نصب العین** ۔ مصنفہ خان فضل کریم خان درانی ۔ بی ۔ اے سابق ایڈیٹر ٹروتھ ۔ صفحات ۹۶ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ ۔ حلیم بک ڈپو سانکلی اسٹریٹ ۔ بائکلہ ۔ بمبئی ۔

(۲) **اقبال اور اس کا پیغام** ۔ مصنفہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد و میاں محمد رفیق خاور ۸۰ صفحات ۔ طباعت ۔ کتابت ۔ کاغذ ۔ جلد عمدہ ۔ قیمت ۸ر ۔ شائع کردہ ۔ ہاشمی بکڈپو ۔ لاہور

(۳) **انقلابی مولوی یا آنکھ کا تارا** ۔ سوانح حیات مولانا عبداللہ صاحب سندھی از مسٹر محمد رحیم چمن ۔ دہلوی ۔ ۳۷ صفحات ۔ کتابت ۔ کاغذ نفیس مضمون سب سطحی ۔ پبلشرز ۔ اردو بکڈپو ۔ پوسٹ بکس ۱۲۵ دہلی ۔ قیمت چھ آنے ۔

نوٹ

اہمیت کے لحاظ سے ہم نے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی اسکیم "متبادل دستورِ ہند" علیحدہ طبع کرائی ہے ۔ دفتر سے طلب فرمائیے ۔ قیمت ار صرفہ ڈاک ۰ر (منیجر)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ایڈیٹر "ترجمان القرآن"

یہ بے نظیر کتاب دو رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ۔ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک نہایت ہی جامع۔ پُرخیال اور سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے ہندوستان کے گذشتہ انقلابات نے مسلمانوں پر کیا کیا اثرات چھوڑے اور اب جو انقلاب آرہا ہے وہ مسلمانوں کو کہاں پہنچا جائیگا؟ اسوقت ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا ہرگز نہ کرنا چاہیئے؟ یا اور دیگر متعلقہ سوالات ایسی حکیمانہ صحتِ نظر کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں۔ کہ ایک دفعہ بغور پڑھ لینے کے بعد ہندوستان کی اسلامی سیاست آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اور ہمارے قومی مسئلہ کا کوئی پہلو بھی غیر واضح نہیں رہتا۔ فاضل مؤلف کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا دعویٰ ہے۔ کہ اس بلند پایہ اور ٹھوس حقائق سے مملو کتاب کا خود پڑھنا اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانا بجائے خود ایک جہاد ہوگا۔ اور بہت بڑے ثواب کا موجب۔ یہ کتاب کسی تجارتی غرض سے شائع نہیں کی گئی۔ بلکہ مسلمانوں کی سیاسی تعلیم مقصود ہے۔

قیمت حصہ اوّل چار آنے (۱۳۵ صفحات) قیمت حصہ دوم۔ آٹھ آنے (۲۳۵ صفحات)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر "ترجمان القرآن" ملتان روڈ۔ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام امتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اِس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں ان کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین!

کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ /

نمونہ مفت طلب فرما کر حسن بیداری کا فیصلہ کیجئے! (منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K. from TuluеIslam Office, Delhi.